رنگِ خیال

محترم قارئین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سہ ماہی علمی وفکری وتحقیقی مجلہ ''التفسیر'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ ہماری اولین کوشش ہے۔ امید ہے آپ پسند فرمائیں گے۔ ہم نے اس مجلہ کا نام التفسیر منتخب کیا ہے۔ جو بالعموم قرآن مجید کی نسبت سے بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ واضح ہو کہ ہم نے تفسیر کے بجائے التفسیر رکھا ہے، یعنی الف لام تعریفی داخل کر کے نکرہ کو معرفہ بنایا ہے۔

اس نام کے انتخاب کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم نے اپنی فکر کا مرکز ومحور قرآن اور صاحب قرآن کو بنایا ہے۔ قرآن اور صاحب قرآن، دونوں لازم وملزوم ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ کی ذات والاصفات قرآن کی مجسم تفسیر ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ لفظ تفسیر اپنے لغوی معنی ومفہوم میں کسی بھی امر کے واضح کرنے، کھولنے اور منکشف کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گویا ہر دو اعتبار سے یہ نام ''آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے'' کا مصداق ہے۔

مگر اصل بات یہ ہے کہ کوئی بھی اچھا نام اس وقت تک اچھا ہے، جب تک اس کا مسمّٰی اچھا ہے۔ فقط نام کے اچھا ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے جب تک کہ کام اچھا نہ ہو۔ چنانچہ ہماری کوشش ہوگی کہ اپنے مجلہ کے نام کی لاج رکھیں اور واقعی اسم بامسمّٰی کر دیں۔

اس مجلہ کے لیے ہماری پالیسی سر دست یہ ہے کہ ابھی یونیورسٹیز، کالجز اور مستند دینی مدرسوں، دارالعلوموں کے اساتذہ کرام کے مضامین شائع کیے جائیں۔ نیز ان افراد کے بھی، جو تحقیقی کاموں میں مصروف عمل ہیں، یعنی ایم۔ فل یا پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں جید علمائے کرام اور معروف علمی وفکری وتحقیقی شخصیات کے مضامین بھی زینتِ قرطاس ہوں۔

ان مضامین کی اشاعت سے ہمارا مقصد قرآن وسنت کی روشنی میں، عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق فکر ونظر کی تطہیر ہے۔ جسکے بغیر کوئی بھی عمل، مثبت ردعمل کا محرک نہیں بنتا۔ اور معاشرے میں کوئی مفید تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ ہم اپنی محدود صلاحیتوں اور محدود وسائل کے ساتھ اپنی سرگرمیوں کا آغاز کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس مشن میں کامیاب فرمائے! آمین۔

ادارہ

اسلام کی عالمگیری اور تصورِ جہاد

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

جب ہم کہتے ہیں کہ اسلام ایک عالمگیر دین ہے تو اسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کل عالم کے لئے ہے۔ کسی مخصوص زمانے اور کسی خاص قوم کے لئے نہیں ہے۔ اسکے اصول سب کے لئے یکساں نافذ العمل ہیں۔ اس کے دامن میں اتنی وسعت ہے کہ وہ اپنے اصولوں کے ساتھ سب پر مستولی ہو سکتا ہے اور زمانے کے ہزار ہا تغیر و تبدل کے باوجود اسکی ضرورت کا سب کو اقرار ہے۔ اسکی تعلیمات انتہائی سادہ، برمحل اور عقل و فطرت کے عین مطابق ہیں۔ مثلاً اسلام کے اصول مساوات کو ہی لے لیں۔ اس سے اچھے اصول اب کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ اسلام کا تصور امت بھی اسی اصول مساوات کا حصہ ہے۔ امت میں سب مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے اور حصول تقویٰ میں مسابقت کی راہ سب کے لئے کھلی ہے۔ واجعلنا للمتقین اماما (الفرقان ۷۴) یہ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے ہر انسان کے دل کی پکار ہے۔

مختصر یہ کہ اسلام کے ماننے والے قرآن نہ سمجھنے کی وجہ سے یا اس پر عمل پیرا نہ ہونے کے سبب دیگر مذاہب و اقوام سے شکست کھا سکتے ہیں۔ لیکن اسلام کے اصول ناقابل شکست ہیں۔ بلکہ مسلمانوں کو شکست دینے والے، خود اسلام کے اصولوں سے شکست کھا چکے ہیں۔ مثلاً عیسائیت کی تثلیث یا ہندومت کی الوہیت اسلام کے عقیدہ توحید سے شکست کھا چکی ہے۔

اسلام کا تصور جہاد کیا ہے؟ عصر حاضر کے تناظر میں اسے سمجھنے کی اشد ضرورت ہے۔ ایک ناقابل تردید حقیقت کے طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ روئے زمین پر دنیا کا واحد ''مذہب'' اسلام ہے کہ جو جنگ کے لئے کچھ مستقل اصول اور قوانین متعین کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ دفاعی جنگ کا قائل ہے، اقدامی جنگ کا نہیں اور اگر اس نے کہیں بظاہر اقدامی جنگ کا حکم بھی دیا ہے تو اس کے پیچھے اصل محرک کے طور پر دفاعی پہلو ہی کارفرما ہے

۔۔۔ دوسرے یہ کہ وہ جنگ کو زمانی اور مکانی ہر دو اعتبار سے پھیلنے یا پھیلانے سے روکتا ہے۔ اس کا دائرہ جنگ بڑا محدود ہوتا ہے۔ سوم یہ کہ وہ اس وقت تک جنگ جاری رکھنے کا حکم دیتا ہے، جب تک مخالف فوج اس سے مقابلہ آرا رہتی ہو، اگر مخالف فوج پیچھے ہٹ جائے یا ہتھیار ڈال دے تو جنگ کا سلسلہ فوراً روک دیا جاتا ہے۔ چہارم یہ کہ اسلامی جنگ میں دشمن کو اتنا ہی نقصان پہنچانا مقصود ہوتا ہے، جتنا اس نے مسلمانوں کو پہنچایا ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔ پنجم یہ کہ وہ سال کے مستقل چار مہینے جنگ کے لئے حرام قرار دیتا ہے۔ ششم یہ کہ اسلامی جنگ فی سبیل اللہ ہوتی ہے، فتوحات ملکی اور اغراض قومی کے لئے نہیں ہوتی۔

اب ان اصولوں کی قدرے تفصیل عرض ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ اسلامی جنگیں دفاعی ہوتی ہیں، اقدامی نہیں۔ قرآن مجید میں قتال کرنے یا دفاع کرنے کے سلسلے میں دو طرح کے صیغے استعمال کئے گئے ہیں۔ قتال کرنے کا صیغہ "اقتلوھم" اور دفاع کرنے کا صیغہ "قاتلوا" ہے۔ جہاں یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ اقتلوھم کا صیغہ اقدام کے لئے ہے نہ کہ دفاع کے لئے۔ چنانچہ یہ مغالطہ اپنے ازالہ کے لئے ذرا تفصیل کا متقاضی ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ قاتلوا باب مفاعلہ سے ہے اور اقتلوا باب نصر ینصر سے ہے۔ قاتلوا اور اقتلوا دونوں امر کے صیغے ہیں لیکن دونوں میں فرق ہے۔ قاتلوا کا معنی ہوتا ہے ان کو مارو جو تمہیں مارتے ہیں۔ گویا اس میں شرکت باہمی بالفعل بطور لازمی عنصر کے موجود ہوتی ہے۔ ورنہ قاتلوا کا صیغہ اپنے معنی پر ٹھیک نہیں بیٹھتا اور اقتلوا میں شرکت باہمی بالفعل ہونا ضروری نہیں۔ کسی بھی جانب سے پہل ہو سکتی ہے۔ مگر اسلامی جنگ میں اقتلوا کا صیغہ بالقوہ شرکت باہمی کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ جنگ مسلمانوں کی طرف سے یکطرفہ جارحانہ شروع نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی ایک طرح کی دفاعی ہی ہوتی ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں مسلمانوں کو جہاں بھی اقتلوھم کا حکم دیا گیا ہے اس کی حقیقت سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلا مقام کہ جہاں اقتلوھم کا حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے۔

واقتلوهم حيث ثقفتموهم واخرجوهم من حيث اخرجوكم والفتنة اشد من القتل ولا تقاتلوهم عند المسجد الحرام حتى يقاتلوكم فيه فان قاتلوكم فاقتلوهم كذلك جزاء الكافرين فان انتهوا فان الله غفور رحيم (البقرۃ: ۱۹۱-۱۹۲)

اور ان کو جہاں پاؤ مارو اور انہیں (وہاں سے) نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا، اور فتنہ قتل سے بڑھا ہوا (فعل) ہے۔ اور مسجد حرام کے قریب ان سے جنگ نہ کرو جب تک کہ وہ اس کے اندر تمہارے ساتھ جنگ (نہ) کریں۔ پھر اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تم ان کو مارو، کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ (دشمنوں سے تمہاری) حفاظت کرنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے۔

درحقیقت اس مقام پر واقتلوھم میں ضمیر ان ہی لوگوں کی طرف راجع ہے جن کا ذکر آیت ما قبل

(البقرۃ:۱۹۰) میں ہوا ہے۔ وقاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم ولا تعتدوا ۔۔ الخ اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو۔ جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔ (اور جنگ میں) حد سے نہ بڑھنا۔ پس الذين يقاتلونكم نے واقتلوھم کا معنی متعین کر دیا ہے، جو دفاعی جنگ کی طرف مشیر ہونے میں بالکل صاف ہے۔ اور ثقفتموھم کا لفظ اختیار کر کے یہ بھی بتا دیا کہ اندھا دھند مارنا مراد نہیں، صرف دشمن کو مارنا مراد ہے۔ دشمن قوم کے دیگر افراد اس سے مستثنیٰ ہیں۔

امام راغب اصفہانی نے ثقف کے بنیادی معنی کسی چیز کے بھانپ لینے اور پالینے میں مہارت اور کسی کام کے کرنے میں حذاقت کے لئے ہیں۔ ثقفت کذا۔ میں نے کسی چیز کو مہارت نظر کے ذریعہ تاڑ لیا۔ اس کے بعد یہ لفظ محض پالینے کے مفہوم میں بھی استعمال ہونے لگا۔ خواہ اس کے ساتھ نگاہ کی مہارت شامل ہو یا نہ ہو۔ صاحب منجد نے لکھا ہے کہ اس کے معنی غلبہ پالینے کے بھی ہیں۔ مگر یہاں اصل معنی ہی مراد لئے گئے ہیں اور دوسرے معنی اصل کے تابع معلوم ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ "تم انہیں جہاں بھانپ لو اور غلبہ پالو تو انہیں قتل کردو"

دوسرے فقرے (واخرجوهم من حيث اخرجوكم) میں جنگ کی حد کو بیان کیا ہے کہ کفار نے مسلمانوں کو بلاوجہ مکے سے بے دخل کیا تھا۔ اس لئے اے مسلمانو! تم اس وقت تک جنگ جاری رکھنا جب تک تم انہیں مکے سے بے دخل نہ کر دو۔ اس میں مسلمانوں کے لئے بالآخر فتح و کامیابی کی نوید بھی پوشیدہ ہے۔

تیسرے فقرہ میں کفار کی منفی فعالیت کو "فتنہ" قرار دے کر اسے جنگ سے بڑھا ہوا فعل بتایا گیا ہے۔

(والفتنة اشد من القتل)

فتنہ کے متعدد معانی میں سے ایک معنی عذاب اور دکھ وغیرہ دینے کے بھی آتے ہیں۔ جیسے قرآن مجید میں بھی ان دکھوں اور تکلیفوں پر اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ جو کفار مومنین کو دیتے تھے۔

ان الذين فتنوا المؤمنين والمؤمنات ..الخ (البروج:۱۰)

بے شک جن لوگوں نے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو ایذائیں دیں۔ (ڈپٹی نذیر احمد دہلوی)

فاذا اوذي في الله جعل فتنة الناس كعذاب الله .. الخ (العنکبوت:۱۰)

پھر جب اللہ کی راہ میں کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو لوگوں کی ایذا دہی کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کی طرح بنا لیتے ہیں۔

(محمد جونا گڑھی)

ان ہر دو آیات میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایذا دیے جانے کو فتنہ قرار دیا گیا ہے۔ اور یہی وہ فتنہ ہے جو قتل سے بڑھ کر ہے۔ پس اقتلوھم کا حکم ایسے ہی فتنہ پروروں کے لئے آیا ہے۔ ان کا فتنہ ان کے قتل کا باعث ہے۔ پس یہ اقتلوا کا حکم بھی دراصل دفاعی حکم میں شامل ہے۔

چوتھے فقرے میں مسلمانوں کو مسجد حرام کے قریب جنگ سے روکا گیا ہے۔ ہاں اگر کفار جنگ میں پہل کریں تو بامر مجبوری، مسلمانوں کو حق دفاع حاصل رہے گا۔

پانچویں فقرے میں ارشاد ہوا ہے۔ فان قاتلوکم فاقتلوھم ط۔۔الخ پھر اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تم ان کو مارو۔ یہاں بھی اقتلوا کا صیغہ قاتلوا کی شرط کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ نیز اسی دشمنوں اور مخالفوں کے لئے آیا ہے۔ جو زیر بحث ہیں۔ فان انتھوا فان اللہ غفور رحیم پھر اگر وہ رک جائیں تو اللہ غفور رحیم ہے۔ یہاں غفور رحیم کی صفات اس امر کی مشیر ہیں کہ ان کے رک جانے پر مسلمانوں کو بھی جنگ سے رکنا ہوگا۔

پس اس آیت میں اقتلوھم کا صیغہ اپنی تفصیل کے ساتھ یہ مفہوم واضح کر رہا ہے کہ وہ یہاں اقدامی جنگ کے معنی میں نہیں بلکہ دفاعی جنگ کے معنی میں ہے۔۔اور وہ اقتلوا کے صیغہ جمع سے یہ نکتہ بھی نکلتا ہے کہ قتال کوئی انفرادی فریضہ نہیں ہے بلکہ ایک امر اجتماعی ہے جو امام کی معیت وقیادت میں ادا ہوگا۔ گویا لشکر کا وجود اور اسکا وجوب بطور عبارت النص کے اور امام کا وجود وجوب بطور اقتضاء النص کے ثابت ہوا۔ کیونکہ لشکر کا انتظام و اجتماع بغیر امام کے ممکن نہیں ہے۔

عصر حاضر کا یہ انتہائی اہم مسئلہ ہے کہ" قتال "بغیر حکومت کی اجازت کے امر مشروع ہے یا غیر مشروع۔ اس ضمن میں نظم اجتماعی کے پہلو سے میں اسے غیر مشروع سمجھتا ہوں۔ مشروع قتال کے لئے حکومت کی اجازت (Sanction) ضروری ہے۔ ورنہ ملک وقوم میں ابتری پھیل جائے گی اور نظم عامہ مختل ہو جائے گا۔

۲۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہوا:

ودوا لو تکفرون کما کفروا فتکونون سواء فلا تتخذوا منھم اولیاء حتی یھاجروا فی سبیل اللہ ط فان تولوا فخذوھم واقتلوھم حیث وجدتموھم ولا تتخذوا منھم ولیا ولا نصیرا ' الا الذین یصلون الی قوم بینکم وبینھم میثاق اوجاء وکم حصرت صدورھم ان یقاتلوکم اویقاتلوا قومھم ط ولو شاء اللہ لسلطھم علیکم فلقتلوکم ج فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا ' ستجدون اٰخرین یریدون ان یامنوکم ویامنوا قومھم ط کلما ردوا الی الفتنۃ ارکسوا فیھا ج فان لم یعتزلوکم ویلقوا الیکم السلم ویکفوا ایدیھم فخذوھم واقتلوھم حیث ثقفتموھم ط واولئکم جعلنا لکم علیھم سلطانا مبینا (النساء:۸۹۔۹۱)

وہ (منافق تو) یہ تمنا کرتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو۔ جیسے انہوں نے کفر کیا تاکہ تم سب برابر ہو جاؤ۔ سو تم ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں۔ پھر اگر وہ روگردانی کریں تو تم انہیں پکڑلو اور جہاں پاؤ انہیں قتل کرو اور ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ۔ مگر ان لوگوں کو (قتل نہ کرو) جو ایسی قوم

سے جا ملیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ (امان) ہو یا وہ (ہمت ہار کر) تمہارے پاس اس حال میں آجائیں کہ ان کے سینے (اس بات سے) تنگ آچکے ہوں کہ وہ تم سے لڑیں یا اپنی قوم سے لڑیں اور اگر اللہ چاہتا تو یقیناً انہیں تم پر غالب کر دیتا تو وہ تم سے ضرور لڑتے۔ پس اگر وہ تم سے کنارہ کشی اختیار کرلیں اور تمہارے ساتھ جنگ نہ کریں اور تمہاری طرف صلح (کا پیغام) بھیجیں تو اللہ نے تم کو بھی ان کے خلاف کسی اقدام کی اجازت نہیں دیتا۔ اور دوسرے کچھ ایسے لوگوں کو بھی تم پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ (منافقانہ طریقے سے ایمان ظاہر کر کے) تم سے بھی امن میں رہیں اور (پوشیدہ طریقہ سے کفر کی موافقت کر کے) اپنی قوم سے بھی محفوظ رہیں۔ مگر جب بھی (مسلمانوں کے خلاف) فتنہ انگیزی کی طرف پھیرے جاتے ہیں تو وہ انہیں اوندھے کو پڑتے ہیں۔ سو اگر یہ لوگ تم سے (لڑائی میں) کنارہ کش نہ ہوں اور تم سے صلح جو یا نہ رویہ نہ رکھیں اور اپنے ہاتھ (فتنہ انگیزی سے) نہ روکیں تو تم انہیں پکڑ لو اور قتل کر ڈالو جہاں کہیں پاؤ اور یہ وہ لوگ ہیں جن پر ہم نے تمہیں کھلا اختیار دیا ہے۔

مذکورۃ الصدر آیات میں دو مرتبہ اقتلوھم کا صیغہ استعمال ہوا ہے پہلے اقتلوھم کا مصداق کون لوگ ہیں؟ نیز یہاں اقتلوھم اقدامی جنگ کے لئے آیا ہے۔ یا یہ بھی دفاعی جنگ کے لئے مذکور ہوا ہے۔ اسے جاننے کے لئے قدرے وضاحت ضروری ہے۔

سب سے پہلے تو یہ جان لیجئے کہ یہ احکام ان منافقوں کے لئے آئے تھے۔ جو مسلمانوں کو کافر بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کو ان منافقوں کی دوستی سے منع کیا گیا تھا۔ بجز ان کے کہ جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرکے عمل سے گزر کر اپنا ایمان واخلاص ثابت کریں۔ پھر ہجرت کے عمل سے گزرنے کے بعد اگر وہ دوبارہ اسلام کے دشمنوں سے جا ملیں تو ایسے خطرناک منافقوں کے لئے واقتلوھم حیث وجدتموھم کا حکم آیا تھا۔ مگر یہ حکم بھی کچھ مستثنیات کے ساتھ آیا تھا۔

استثنائے اول: وہ منافقین اگر ایسی قوم سے جا ملے ہوں، جس سے مسلمانوں کا معاہدہ امان ہو چکا ہو تو انہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔

استثنائے دوم: یا وہ مسلمانوں کے پاس ایسی حال آئے ہوں کہ ان کی ہمتیں ٹوٹ چکی ہوں کہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کریں یا اپنی قوم سے انہیں بھی قتل نہیں کیا جائے گا۔

استثنائے سوم: اگر یہ لوگ مسلمانوں سے الگ تھلگ رہیں اور ان سے جنگ نہ کریں اور صلح کی درخواست بھیجیں تو انہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔

دوسرے اقتلوھم سے مراد وہ منافقین ہیں کہ جنکی اولین کوشش تو یہ تھی کہ وہ بظاہر مسلمانوں سے بنائے رکھیں اور بباطن کفار سے اپنی سابقہ تعلق داری برقرار رکھیں تاکہ ہر دو طرف سے امان میں رہیں۔ لیکن اگر وہ کفار کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لئے بلائے جائیں تو ذرا دیر نہ لگائیں جیسا کہ آیا ہے کہ کلما ردوا الی الفتنۃ ارکسوا فیھا ج۔۔الخ وہ جب بھی فتنہ کی طرف لوٹائے جائیں تو اس میں اوندھے گر جائیں۔ چنانچہ

ایسے خطرناک منافقوں کے لئے آیا ہے کہ اگر وہ جنگ میں مسلمانوں سے کنارہ کشی اختیار نہ کریں اور اپنے ہاتھوں کو نہ روکیں تو ایسے لوگوں کو قتل کر دیا جائے۔

ان آیات کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں بھی اقتلوھم، اقدامی قتل کے لئے نہیں بلکہ دفاعی قتل کے لئے آیا ہے۔

۳۔ سورۂ توبہ میں ارشاد ہوا۔

فاذا انسلخ الاشهر الحرم فاقتلوا المشركين حيث وجدتموهم وخذوهم واحصروهم واقعدوا لهم كل مرصد ج فان تابوا واقاموا الصلوة واتوا الزكوة فخلوا سبيلهم ط ان الله غفور رحيم ۵ (التوبہ ۵)

پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو (حسب اعلان عہد شکن) ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور ان کو گرفتار کر لو اور ان کا محاصرہ کرو اور ان کے لئے ہر گھات کی جگہ بیٹھو، پھر اگر وہ (جنگ سے) توبہ کریں اور (پر امن شہری بنکر) نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ میں تمہارے شریک حال ہو جائیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، بیشک اللہ حفاظت کرنے والا اور بہ دوام رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں حرمت والے مستقل مہینوں کے علاوہ عارضی طور پر قائم کئے گئے حرمت کے چار الگ مہینوں میں مسلمانوں کو جنگ کرنے سے روکا گیا ہے۔ یہ اعلان ذوالقعدہ ۹ھ میں حج اکبر کے دن کیا گیا۔ اور اس سورۃ کی آیت نمبر ۲ میں مشرکین مکہ کو جن چار ماہ کی مہلت دی گئی تھی، وہ بھی چار ماہ تھے۔ جو اعلان والے دن سے نافذ العمل ہوئے۔ ان مہینوں کی مدت حرمت ۱۰ ذوالقعدہ سے شروع ہو کر ۱۰ ربیع الاول کو ختم ہوئی۔ جیسا کہ امام ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی (متوفی ۳۷۰ھ) نے لکھا ہے ان چار مہینوں کی ابتداء ۱۰ ذوالقعدہ سے ہوئی اور ذوالحجہ، محرم، صفر اور دس دن ربیع الاول پر ختم ہوئی۔ ۵

یہ امر قابل توجہ ہے کہ جن لوگوں نے بدعہدی کا ارتکاب کیا تھا۔ اس آیت میں ان سے معاہدہ توڑنے کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ نیز انہیں چار ماہ کی مہلت بھی دی جا رہی ہے۔ ان پر اچانک حملہ نہیں کیا جا رہا یہ ہیں اسلام کے جنگی اصول۔

دوسرے یہ کہ اس آیت میں "فاقتلوا" کے مصداق، فقط اس دور کے وہ مشرکین تھے، جو فتح مکہ کے بعد بھی اپنی مذموم اور معاندانہ سرگرمیوں میں بدستور ملوث تھے۔ انہیں اولاً فتنہ انگیزی سے روکنے کے لئے چار ماہ کی مہلت دی گئی یعنی اگر وہ اس عرصہ میں اپنی اصلاح کر لیں تو ان سے تعرض نہیں ہوگا۔ بصورت دیگر انہیں ان کے جرم کی پاداش میں قتل تک کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۴ بھی دیکھئے۔

الا الذين عاهدتم من المشركين ثم لم ينقصوكم شيئا ولم يظاهروا عليكم

احدا فاتموا اليهم عهدهم الى مدتهم ان الله يحب المتقين

مگر وہ مشرکین جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا پھر انہوں نے تمہارے ساتھ (عہد پورا کرنے میں) کچھ کمی نہ کی اور تمہارے خلاف کسی کی پشت پناہی نہ کی تو ان سے ان کا عہد اگلی مدت (معینہ) تک پورا کرو، بے شک اللہ پرہیز گاروں کو پسند فرماتا ہے۔

اس آیت کا مفاد یہ ہے کہ آیت مابعد میں جو "قتل مشرک" کا حکم دیا گیا ہے۔ قبل ازیں اس کا استثناء کر دیا جائے اور بتا دیا جائے کہ قتل صرف ان مشرکوں کا ہوگا، جنہوں نے بار بار نقض عہد کیا ہے۔ یہ آیت پڑھنے کے بعد ہر مسلمان بآسانی باور کر سکتا ہے کہ "قتل مشرک" کے تعلق سے آنے والی آیت اور اس آیت کے ماقبل و ما بعد نے معاہد مشرک کو قتل کرنے سے روکا ہے۔ صرف وہی مشرکین لائق قتل ہیں جو نقض عہد کے مرتکب ہوئے۔

دوسرے یہ کہ بدامنی کے مرتکب ناقض عہد مشرکوں کے لئے صرف قتل کرنا ہی متعین نہیں ہوا بلکہ انہیں گرفتار کرنا، انہیں محصور رکھنا اور ان کی تاک میں ہر گھات میں بیٹھنا بھی ارشاد ہوا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس سزا کی غرض اصلاً ان مشرکوں کو فتنہ و فساد سے روک دینا تھا اور بس البتہ یہ ضرور ہے کہ اس مقصد کے لئے اگر انہیں قتل بھی کرنا پڑے تو یہ انتہائی قدم بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ شریروں اور فتنہ گروں کو قتل کرنا قیام امن کے لئے بہت ضروری ہوتا ہے۔

اسی طرح سورۂ توبہ میں یہ بھی آیا ہے۔

وان احد من المشركين استجارك فاجره حتى يسمع كلام الله ثم ابلغه مامنه ۔۔۔ الخ (توبہ ۶)

اگر ان مشرکوں میں سے کوئی بھی آپ سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دے دیں۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر آپ اسے اس کے مامن (جائے امن) تک پہنچا دیں۔

اس آیت نے بھی اس مسئلہ کو بہت صاف کر دیا ہے۔ کیونکہ انہیں مشرک کے پناہ طلب کرنے اور امان چاہنے پر امان دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مشرکین مکہ کو بوجہ ان کے شرک، قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ بلکہ بوجہ انکی عہد شکنی قتل کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

اسی طرح التوبہ کی آیت نمبر ۱۲ میں فقاتلوا ائمة الكفر کا حکم ارشاد ہوا ہے۔ یہ حکم ان لوگوں کے لئے آیا ہے، جو اپنی قسموں سے مضبوط کئے گئے عہدوں کو توڑ دیں اور مسلمانوں کے دین پر طعن کریں، نیز آیت نمبر ۱۳ میں ایسے ہی لوگوں کے لئے یہ بھی مذکور ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے (ماضی میں) رسول محترم کو جلا وطن کرنے کی ٹھانی تھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے تمہارے مقابلے میں لڑائی کی خود ہی ابتداء کی تھی۔۔۔ پھر آیت نمبر ۱۴ میں انہیں مجرموں کی سرکوبی کے لئے قاتلوھم کا حکم بھی آیا ہے۔

ان تینوں آیات کو یک نظر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں قتال کی علت ان کافروں کا نقض عہد،

ملکیت ایمان، جرم ارادہ اخراج رسول اور جرم ابتدائے جنگ وقتال ہے۔ نہ کہ ان کا کفر وشرک یا نفاق وغیرہ۔ نیز اس جگہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انہیں کفر کے سرغنوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نہ کہ عام کفار سے۔

اسلام کا اصول صلح پسندی

وان جنحوا للسلم فاجنح لہا وتوکل علی اللہ ۔۔۔ الخ (الانفال:۶۱)

اور اگر وہ (کفار) صلح کے لئے جھکیں تو آپ بھی صلح کی طرف جھک جائیں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ اس آیت میں ان کفار سے صلح کی بات ہو رہی ہے۔ جو اسلام کے بدترین دشمن تھے، جنہیں خائن یعنی غدار قرار دے کر ان کے مقابلے میں ہر دم مستعد رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مگر ان ساری باتوں کے باوجود اگر ایسے محاربین بھی مائل بہ صلح ہوں تو مسلمانوں کو بھی ان کی مصالحت قبول کرنے کا حکم دیا گیا۔ کیا اس سے بڑھکر مہذب اور ترقی یافتہ بات کوئی اور ہو سکتی ہے۔ اس آیت کے ماقبل میں، مسلمانوں کو جنگی استعداد اور صلاحیت بڑھانے کا حکم ملا تھا اور اس آیت میں صلح کرنے کا حکم آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان باوجود جنگی تیاریوں کے، صلح کو جنگ پر ترجیح دیں۔ یہ ہے اسلام کا نظریہ جہاد، کیا ایسے دین کو ان کی اصولی تعلیمات کی روشنی میں دہشت گرد اور مخالف امن وامان قرار دیا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۶۱ میں قُتِّلُوا کا لفظ آیا ہے، جس کا معنی بے دردی سے قتل کرنے کے ہیں۔ یہ لفظ کن لوگوں کے لئے آیا ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے آیت نمبر ۶۰ اور ۶۱ مکمل طور پر دیکھنی ہوں گی۔ ارشاد ہوتا ہے۔

لئن لم ینتہ المنافقون والذین فی قلوبہم مرض والمرجفون فی المدینۃ لنغرینک بہم ثم لا یجاورونک فیہا الا قلیلا ملعونین ج اینما ثقفوا اُخذوا وقتلوا تقتیلا

منافق اور وہ لوگ کہ جن کی نیتیں بد ہیں اور جو لوگ مدینے میں (جھوٹی جھوٹی) افواہیں پھیلایا کرتے ہیں، اگر (اپنی حرکات سے) باز نہ آئیں گے تو (اے پیغمبر) ہم آپ کو (ایک نہ ایک دن ضرور) ان پر مسلط فرما دیں گے کہ اس کے بعد مدینہ میں وہ آپ کے پاس نہ ٹھہر سکیں گے مگر چند روز۔ یہ لعنت زدہ لوگ ہیں، جہاں کہیں پائے جائیں، پکڑے جائیں اور بے دردی سے قتل کر دیے جائیں۔

مذکورہ بالا آیت میں اینما ثقفوا اخذوا وقتلوا تقتیلا کے الفاظ مدینہ کے منافقوں اور دل کے روگیوں (یعنی جنسی مریضوں) اور افواہ سازوں کے لئے آئے ہیں۔ پھر ان لوگوں کو ملعونین کے لقب سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ اور آیت میں بھی لا یجاورونک فیہا الا قلیلا کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آخری اقدام "جہاں پائے جائیں قتل کر دیے جائیں" ایک مدت معین کے لئے تھا۔ گویا کچھ عرصہ کے لئے

انہیں بغرض اصلاح رخصت دی جائے، اگر وہ ان افعال و حرکات سے باز نہ آئیں تو بری طرح قتل کر دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلامی حکومت کے خلاف جھوٹی خبریں پھیلانے والے اور شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے والے، آوارہ منش لوگ تعزیراً اُخذوا کے تحت گرفتار اور قتلوا کے تحت قتل کئے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ سختی کے بغیر معاشرہ صحیح طور پر کام نہیں کر سکتا۔

یہ آیت دراصل اسلامی حکومت کو اسکی داخلہ پالیسی میں امن کی بنیاد فراہم کر رہی ہے۔ اسمیں ان لوگوں کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو ملک میں نقض امن کا باعث ہوتے ہیں۔ جنگی سرگرمیاں نہ عوام کے حق میں ہوتی ہیں اور نہ ہی حکومت کے۔ یہ لوگ انتشار بد امنی کا سبب بنتے ہیں، معاشرہ میں اخلاقی گراوٹ پیدا کر کے ماحول کو خراب کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے قتل پر افسوس کرنے والے خود اپنے ملک میں اس طرح کے لوگوں کو بھی امان دینا پسند نہ کریں گے بلکہ انہیں اپنا غدار اور دشمن قرار دے کر نشان عبرت بنا دیں گے۔ لہذا اس آیت سے مسلمانوں کو خونریز ثابت کرنے کی کوشش کسی طرح بھی معقول نہیں ہو سکتی۔

سورۃ فتح میں ارشاد ہوا۔

قل للمخلفین من الاعراب ستدعون الی قوم اُولی باس شدید تقاتلونہم او یسلمون ج ۔۔۔ الخ (الفتح:۱۶)

یہ آیت تصور جہاد کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ بالعموم لوگوں نے اسے اسلام یا تلوار کے عنوان سے سمجھا ہے۔ اسلئے وہ اس کا ترجمہ بایں الفاظ کرتے ہیں۔

"جو گنوار پیچھے رہ گئے تھے ان سے کہہ دو کہ تم ایک سخت جنگجو قوم کے (ساتھ لڑائی کے) لئے بلائے جاؤ گے۔ ان سے تم (یا تو) جنگ کرتے رہو گے یا وہ اسلام لے آئیں گے" (فتح محمد جالندھری)

اس مفہوم پر مشتمل جن حضرات کے ترجمے ملتے ہیں ان میں شاہ عبدالقادر دہلوی، شاہ رفیع الدین دہلوی، احمد رضا خاں بریلوی، محمود حسن دیوبندی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، ثناء اللہ امرتسری، مرزا بشیر الدین محمود (قادیانی)، محدث کچھوچھوی، محمد جونا گڑھی، فرمان علی (اہل تشیع)، احمد سعید کاظمی اور امین احسن اصلاحی وغیرہ شامل ہیں۔ نمونے کے طور پر درج ذیل تراجم دیکھئے۔

۱) کہہ دے پیچھے رہ جانے والے گنواروں سے آئندہ تمکو بلائیں گے ایک قوم پر بڑے سخت لڑنے والے تم ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہونگے۔ (محمود حسن۔ اسیر مالٹا)

۲) ان پیچھے رہ گئے ہوئے گنواروں سے فرماؤ عنقریب تم ایک سخت لڑائی والی قوم کی طرف بلائے جاؤ گے کہ ان سے لڑو یا وہ مسلمان ہو جائیں۔ (احمد رضا بریلوی)

۳) تو پیچھے رہنے والے دیہاتیوں کو کہہ دے کہ عنقریب تمکو ایک بڑی جنگی قوم کی طرف بلایا جائیگا تم ان سے لڑو یا وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ (ثناء اللہ امرتسری)

۴) ان سے کہدو کہ عنقریب ہی تم ایک سخت جنگجو قوم کے ساتھ لڑنے کے لیے بلائے جاؤ گے کہ تم (یا تو) ان سے لڑتے ہی رہو گے یا وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ (فرمان علی۔ اہل تشیع)

۵) اہل بدو میں سے ان پیچھے چھوڑے ہوئے لوگوں سے کہدو کہ عنقریب تم لوگ ایک طاقتور حریف سے لڑنے کے لیے بلائے جاؤ گے۔ تم کو ان سے جنگ جاری رکھنی ہوگی یا وہ اسلام لائیں گے۔ (امین احسن اصلاحی)

یہ آیت جس طرح ہمارے مترجمین ومفسرین نے سمجھی اور سمجھائی ہے اس سے اسلام کا پوسچر (Posture) انتہائی خونریزی اور جبر کر کے مسلمان کرنے والے دین کا بنتا ہے، جو ظاہر ہے کہ قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام ہرگز ایسا دین نہیں کہ جو اپنے آپ کو تلوار کے زور سے منوائے۔ بھلا سوچئے کہ جس دین نے لا اکراہ فی الدین کی تعلیم، کھلے لفظوں میں دی ہو، وہ تلوار کے ذریعہ مسلمان کرنے کی تعلیم کیسے دے سکتا ہے؟

بات اصل میں یہ ہے کہ یسلمون کا ترجمہ چونکہ بالعموم اسلام لانے یا مسلمان ہونے سے کیا گیا ہے۔ اس لئے مسلمانوں میں اسی تصور کا پیدا ہونا بھی یقینی امر ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اردو میں کئے گئے بعض تراجم نے یسلمون کا مطلب مسلمان ہونا یا اسلام قبول کرنا نہیں لیا بلکہ یسلمون کا لغوی مفہوم سامنے رکھ کر مقصود قرآنی کو سمجھا ہے۔ چنانچہ ذیل میں چند تراجم پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ تم کو ان سے جنگ کرنی ہوگی یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔ (سید مودودی)

۲۔ یا تم ان سے جنگ کرتے رہو یا وہ اطاعت کر لیں۔ (احمد سعید دہلوی)

۳۔ عبدالحق حقانی نے بھی یسلمون کا ترجمہ اطاعت قبول کرنے سے کیا ہے اور اپنے حاشیہ میں وضاحت کی ہے کہ یسلمون سے اسلام لانا مراد نہیں بلکہ مطیع ہو جانا اور جزیہ قبول کرنا مراد ہے۔

۴۔ خواجہ احمد الدین اور محمد علی نے بھی یسلمون کا ترجمہ فرمانبردار ہو جانے سے کیا ہے۔

۵۔ اشرف علی تھانوی اور عبدالماجد دریابادی کے یہاں اسکا مطلب ”مطیع اسلام“ سے کیا گیا ہے۔
بقول دریابادی کے ”خواہ مسلمان بنکر یا ذمی بنکر“ ہے

۶۔ غلام احمد پرویز اور پیر محمد کرم شاہ الازہری کے یہاں اس کا مطلب علی الترتیب ہتھیار رکھنے اور ہتھیار ڈالنے سے کیا گیا ہے۔

اوپر آپ نے یسلمون کے دونوں طرح کے تراجم ملاحظہ کیجئے۔ طرح اول کے تراجم میں جبراً مسلمان کرنے کا تصور اجاگر کیا گیا ہے جو کہ میرے نزدیک قرآن کی اصولی اور معقولی تعلیم کو ہی باطل کر دینے والا تصور ہے۔ نیز اس ترجمہ سے اسلام کا تصور امن وسلامتی خود معرض خطر میں پڑ جاتا ہے۔۔ جبکہ طرح دوم کے تحت ہونے والے تراجم قرآنی مقاصد ومحاسن سے مالا مال نظر آتے ہیں۔ ان تراجم سے اسلام کی صلح پسندانہ روش، جو کہ قرآنی تعلیمات کے عین مطابق ہے، سامنے آتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسلام اپنے دشمنوں سے جنگ کرنے کا حکم تو دیتا ہے مگر وہ انہیں جبراً مسلمان کرنے سے روکتا ہے۔ اس لئے کہ جبر کا مارا ہوا انسان، اسلام میں منافق بنکر تو رہ سکتا

ہے مسلمان بنکر نہیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ یہ آیت تو ویسے بھی زمانہ رسالت کے لئے مخصوص تھی اسکا اطلاق دور نبوی ﷺ کے بعد کے ادوار پر نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ اسلئے اسکی وضاحت بھی ضروری ہے۔

اوپر آپ نے سورۂ فتح کی جو آیت ملاحظہ کی تھی اسے ایک بار پھر دیکھئے۔

قل للمخلفین من الاعراب ستدعون الیٰ قوم أولی باس شدید تقاتلونهم
او یسلمون ج۔۔۔ الخ (الفتح: ۱۶)

فرما دیجئے ان پیچھے چھوڑے جانے والے بدوی عربوں کو کہ عنقریب تمہیں دعوت دی جائیگی ایک ایسی قوم سے جہاد کی جو بڑی سخت جنگجو ہے، تم ان سے لڑائی کرو گے یا وہ ہتھیار ڈالدیں گے۔ (پیر محمد کرم شاہ الازہری)

ظاہر ہے کہ یہ آیت صلح حدیبیہ کے بعد کے کسی غزوہ کی دعوت ہو سکتی ہے۔ جو غزوہ تبوک سے پہلے واقع ہوا ہو۔ کیونکہ سورۂ التوبہ کی آیت نمبر ۸۳ میں پیچھے رہ جانے والوں کے لئے آیا تھا۔

فقل لن تخرجوا معی ابداً ولن تقاتلوا معی عدوا انکم رضیتم بالقعود اول مرة
فاقعدوا مع الخالفین

آپ جواب دیجئے، تم ہرگز کسی جنگ میں بھی میرے ساتھ باہر نہیں نکلو گے اور نہ ہی تم میری معیت میں دشمنوں کے ساتھ جنگ کرو گے۔ کیونکہ تم پہلی مرتبہ بھی جنگ میں حصہ نہ لینے پر راضی تھے۔ اسلئے آئندہ بھی پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ ہی بیٹھے رہو۔

واضح ہو کہ یہ آیت غزوہ تبوک کے سلسلے کی کڑی ہے۔۔ آپ نے دیکھا کہ سورۂ فتح نے مخلفین کو آئندہ جنگ سے نہیں روکا گیا۔ جبکہ سورۂ توبہ کے مخلفین کو روکا جا رہا ہے۔ چنانچہ سورۂ فتح کی آیت کو اگر زمانہ نبوی ﷺ سے مخصوص نہ کیا گیا تو تضاد لازم آئے گا اور قرآن مجید تضادات سے یکسر پاک ہے۔

اسلام کے تصور جہاد کو سمجھنے کے لئے ان آیات پر بھی تحقیق کی نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے جن میں حرمت والے مہینوں کا تذکرہ ہے۔ ان آیات کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام دنیا کا واحد دین ہے، جو اپنی اصولی تعلیمات کے ذریعے پوری دنیا کو کم از کم چار ماہ جنگ سے محفوظ کر دیتا ہے، اور اس طرح انہیں باقی کے مہینوں میں بھی اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ جنگ سے باز آ سکیں۔ اس ضمن میں اللہ رب العزت کے احکام ملاحظہ ہوں۔

۱۔ یسئلونک عن الشهر الحرام قتال فيه ط قل قتال فيه كبير۔۔۔ الخ
(البقرۃ: ۲۱۷)

(اے رسول! آپ سے حرمت والے مہینہ کی بات پوچھتے ہیں (یعنی لڑائی کی بابت) فرما دیجئے اسمیں جنگ کرنی بہت بڑی بات ہے۔ حرمت کے مہینے کل چار ہیں۔ یعنی محرم الحرام، رجب المرجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ)۔۔۔ الخ الصحیح البخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان الزمان قد استدار كهيئة يوم

خلق الله السموٰت والارض السنة اثنا عشر شهرا منها اربعة حرم ثلث متواليات" ذوالقعدہ ذوالحجة والمحرم ورجب مضر الذی بين جمادی و شعبان ۔[۵]

زمانہ اپنی اصل ہیئت میں گھوم کر آ چکا ہے جس ہیئت پر وہ اس دن تھا جب اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا تھا۔ سال بارہ مہینے کا ہے۔ جن میں سے چار حرمت والے ہیں تین تو متواتر ہیں یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم الحرام۔ چوتھا رجب ہے جو مضر قبیلے کا کہلاتا ہے۔ اور یہ جمادی الاخری اور شعبان کے مابین ہے۔

قرآن مجید نے ان مہینوں کے نام اس لئے نہیں بتائے کہ عربوں میں یہ امر قدیم سے چلا آ رہا تھا کہ وہ ان مہینوں میں جنگ نہیں کرتے تھے۔ تمام راستے کھل جاتے تھے۔ تجارتی شروع ہو جاتیں تھیں اور انہی ایام میں حج کے ایام بھی آ جاتے تھے۔ اور یہ مہینے اپنی شہرت اور تواتر کے اعتبار سے سبھی کو معلوم تھے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ چونکہ پچھلی آیت (البقرہ ۲۱۶) میں جہاد کی فرضیت کا حکم آیا ہے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا جائے کہ کن کن مہینوں میں جنگ ممنوع ہے۔

۲۔ الشهر الحرام بالشهر الحرام والحرمٰت قصاص ط فمن اعتدى عليكم فاعتدوا عليه بمثل ما اعتدى عليكم ۔۔۔الخ (البقرہ ۱۹۳)

حرمت کے مہینے کا بدلہ حرمت کا مہینہ ہے اور حرمتوں میں برابری کا اصول قائم کیا گیا ہے پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم اس کو اس کے مطابق سزا دو۔ جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو حرمت کے مہینے میں جنگ کرنے سے روکا گیا ہے۔ البتہ اگر ان پر جنگ مسلط ہو جائے تو بدلہ لینا بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ تاکہ دشمن مسلمانوں کی حرمتوں کو انکی کمزوری نہ سمجھ لے۔

۳۔ يا ايها الذين امنوا لا تحلوا شعائر الله ولا الشهر الحرام ولا الهدى ولا القلائد ولا امين البيت الحرام يبتغون فضلا من ربهم و رضوانا ۔۔۔الخ

(المائدہ ۲)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو، اور نہ حرمت والے مہینے کی (بے حرمتی کرو) اور نہ حرم کعبہ کو بھیجے ہوئے قربانی کے جانوروں کی (بے حرمتی کرو) اور نہ مکہ لائے جانے والے ان جانوروں کی جن کے گلے میں علامتی پٹے پڑے ہوں، (بے حرمتی کرو) اور نہ حرمت والے گھر کا قصد کرنے والوں (کے جان و مال و آبرو) کی (بے حرمتی کرو) کیونکہ وہ اپنے رب سے فضل اور خوشنودی چاہتے ہیں۔

اس آیت میں مسلمانوں کو جن چیزوں کی بے حرمتی سے روکا گیا ہے۔ ان میں "شھر الحرام" بھی شامل ہے۔ الشھر الحرام یہاں جنس کے طور پر آیا ہے۔ اس سے مراد تمام حرمت والے مہینے ہیں۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس آیت کے مطابق شعائر اللہ کی حرمت تو برقرار ہو، ہدی اور قلائد کی حرمت بھی برقرار ہو۔ اور امین البیت کی حرمت بھی برقرار رہو۔ گویا کوئی حرمت بھی منسوخ نہ ہوئی ہو۔ مگر شہر حرام کی حرمت منسوخ ہو گئی ہو۔ کیا یہ عقل میں آنے والی بات ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس آیت میں موجود تمام امور آج بھی امت مسلمہ کے نزدیک یکساں محترم ہیں۔ بصورت دیگر تمام حرمتوں کا نسخ لازم آئے گا اور وہ کسی کو بھی تسلیم نہیں ہے۔[۹]

۴۔ ان عدة الشهور عند الله اثنا عشر شهرا فى كتاب الله يوم خلق السموٰت والارض منها اربعة حرم ط ذلك الدين القيم فلا تظلموا فيهن انفسكم قف وقاتلوا المشركين كافة كما يقاتلونكم كافة ط واعلموا ان الله مع المتقين

(التوبہ ۳۶)

بے شک اللہ کے نزدیک مہینوں کی گنتی اسکی کتاب میں بارہ ہے، جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا۔ ان مہینوں میں چار حرمت والے ہیں۔ یہی سیدھا دین ہے تو ان مہینوں میں (جنگ کر کے) تم اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو اور تم بھی تمام مشرکوں سے اسی طرح (جوابی) جنگ کیا کرو، جس طرح وہ سب کے سب اکٹھے ہو کر تم سے کرتے ہیں۔ اور یقین کر لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

اس آیت میں جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ سال کے مہینے بارہ ہیں۔ وہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان بارہ مہینوں میں چار حرمت والے ہیں۔ اور اس حرمت کا حکم فقط ہماری یا کسی خاص نبی کی شریعت کا حکم نہیں ہے۔ بلکہ یہ حکم تمام نبیوں اور رسولوں کی شریعت میں مشترک ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح سال کے بارہ مہینوں کا حکم تمام شریعتوں میں مشترک رہا ہے۔

پیش نظر آیت میں دراصل اسلامی جنگ کا ایک اہم قانون بیان کیا گیا ہے اور وہ ہے حرام مہینوں کے احترام کا قانون۔ اس آیت میں "کتاب اللہ" کی تعبیر، جہاں قرآن مجید سے متعلق ہے وہیں دیگر آسمانی کتب کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ لیکن یوم خلق السموٰت والارض سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کتاب سے مراد لوح آفرینش ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس دن سے زمین و آسمان قائم ہے۔ اس دن سے یہ بات بھی قائم ہے کہ سال کے مہینے بارہ ہوں اور منشاء الٰہی حرم کے ٹکڑے سے پتہ چلتا ہے کہ ان بارہ مہینوں میں چار مہینوں کی حرمت بھی اسی دن سے قائم ہے جس دن زمین و آسمان کی تخلیق عمل میں آئی۔

چند ایک روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ چار ماہ جنگ کی یہ حرمت دین ابراہیمی کے علاوہ یہود و نصاریٰ اور باقی آسمانی ادیان میں بھی تھی اسی لئے حرمت کے اس قانون کو دین قیم سے اور ان مہینوں کی بے حرمتی کو ظلم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ تفسیر جلالین میں بھی مذکور ہے۔[۱۲]

چونکہ اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کے اس امن پسند قانون سے دشمن فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اس لئے ساتھ ہی وقاتلوا المشركين كافة كما يقاتلونكم كافة کا حکم دے کر دفاعی

جنگ کا بھی حکم دے دیا گیا۔ مطلب یہ کہ مسلمان ان مہینوں میں از خود کوئی جنگ نہیں کر سکتے۔ تاہم وہ اپنے اوپر مسلط کی گئی جنگوں کا جواب ضرور دے سکتے ہیں۔

اس قانون سے اسلام کے امن پسند ہونے کا صاف پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنے ماننے والوں کو سال کے چار مہینوں میں جنگ بندی کا حکم دے کر، دنیا کو امن و آشتی اور صلح پسندی کا پیغام دیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ امن و آشتی کے پیغام کا اعادہ کیا ہے۔ کیونکہ یہ پیغام تو دوسرے مذاہب کے پاس بھی تھا جسے بھلا دیا گیا یا تحریف کا شکار کر دیا گیا۔ اس لئے نسی کی رسم کو کفر میں زیادتی قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا۔

۵۔ انما النسی زیادۃ فی الکفر یُضل به الذین کفروا یحلونه عاما ویحرمونه عاما لیواطؤا عدۃ ما حرم اللہ فیحلوا ما حرم اللہ ۔۔۔الخ (التوبہ ۳۷)

(حرمت والے مہینوں کو) آگے پیچھے ہٹا دینا محض کفر میں زیادتی ہے۔ اس سے وہ کافر لوگ بہکائے جاتے ہیں۔ جو ایک سال اس کو حلال گردانتے ہیں اور دوسرے سال حرام، تا کہ ان (مہینوں) کا شمار پورا کریں، جنہیں اللہ نے حرمت دی ہے اور اس (مہینے) کو حلال (بھی) کر دیں۔ جسے اللہ نے حرام فرمایا۔

قرآن مجید نے حرمت والے مہینوں کی دوسرے مہینوں میں منتقلی کو کفر میں اضافہ قرار دیا ہے اس سے حرمت والے مہینوں کا انتہائی اہم اور غیر منسوخ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اتنی واضح اور کھلی ہوئی آیات کے بعد بھی، حرمت والے مہینوں کو منسوخ سمجھنا قرآنی تعلیم کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ آخر میں خلاصہ کے طور پر عرض ہے کہ اسلام

۱۔ دفاعی جنگ کا قائل ہے اقدامی جنگ کا نہیں۔

۲۔ اسلامی جنگیں، اپنے اثر و نفوذ میں زمان و مکان کے اعتبار سے بہت محدود ہوتی ہیں۔

۳۔ دشمن فوج سے ہر وقت، ہر جگہ صلح ہو سکتی ہے۔

۴۔ اسلامی جنگ میں صرف محاربین سے لڑا جاتا ہے۔ عام شہریوں سے تعرض نہیں کیا جاتا۔

۵۔ دشمن کو اتنا ہی نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ جتنا دشمن نے پہنچایا ہوتا ہے۔

۶۔ سال کے چار مہینوں میں جنگ سے شرعاً احتراز (Avoid) کیا جاتا ہے۔ یعنی پہل نہیں کی جاتی۔

۷۔ اسلامی جنگ، امیر کی اجازت (Sanction) کے بغیر نہیں ہوتی۔ نظم اجتماعی کے پہلو سے جہاد کے لئے فی زمانہ پارلیمنٹ کی منظوری ضروری ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ المفردات فی غریب القرآن (عربی) ص ۹۷، نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی

۲۔ محیط المحیط (عربی) جلد اول، بطرس بستانی، سن اشاعت ۱۸۷۰ء بیروت

۳۔ المفردات فی غریب القرآن (عربی) ص ۲۷۳، نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی

۴۔ فتنہ سے مراد یہاں مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنا ہی ہے۔ دیکھئے تفسیر روح المعانی کہ جہاں اس سے مراد قتال المسلمین لی گئی ہے۔

۵۔ امام جصاص نے جس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ اس کا متن مع تخریج کے، علامہ غلام رسول سعیدی نے اپنی تفسیر تبیان القرآن، جلد پنجم، ص ۵۱ پر کر دیا ہے (مطبوعہ ۲۰۰۰ء، فرید بک اسٹال، اردو بازار، لاہور)

۶۔ تفسیر فتح المنان المشہور بہ تفسیر حقانی، جلد ۲، ص ۳۰۴، الفیصل ناشران و تاجران کتب، اردو بازار، لاہور

۷۔ تفسیر ماجدی، جلد دوم، سورہ فتح کا حاشیہ نمبر ۱۹، ص ۱۰۲۲، تاج کمپنی لمیٹڈ، کراچی، سن اشاعت درج نہیں

۸۔ الجامع الصحیح البخاری، امام ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری، باب نمبر ۵۰۷، رقم الحدیث ۳۰۷۷، ناشر فرید بک اسٹال، اردو بازار، لاہور، طبع سوم ۲۰۰۰ء

۹۔ کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم ۔۔۔الخ

۱۰۔ ملا احمد جیون نے تفسیرات احمدیہ میں اس آیت کے تحت لکھا ہے۔

"تفسیر مدارک نے نہ تو شان نزول ذکر کیا ہے اور نہ اس کے منسوخ ہونے یا نہ ہونے کے متعلق کچھ کہا ہے، بلکہ تفسیر ہی اس طرح کی ہے، جس سے نسخ لازم نہیں آتا، یعنی ان امور میں مشغول ہونا، حج میں رکاوٹ پیدا کر سکتا ہے۔ لہٰذا آپس کے جھگڑوں سے بچو، یہ توجیہ زیادہ بہتر ہے، کیونکہ سورۂ مائدہ سب سے آخر میں نازل ہوئی، اس لئے اس میں نسخ کا احتمال نہیں۔

صاحب کشاف لکھتے ہیں کہ یہ آیت محکم ہے (منسوخ نہیں) نبی علیہ السلام سے منقول ہے کہ سورۂ مائدہ قرآن میں سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے۔ لہٰذا اس کی حلال کردہ اشیاء کو حلال اور حرام کردہ اشیاء کو حرام سمجھو۔ حسن سے بھی یہی مروی ہے۔

ان مزوے سے منقول ہے کہ اکیس اٹھارہ واجب احکام ہیں جن میں سے کوئی بھی منسوخ نہیں۔

تفسیرات احمدیہ فی بیان الآیات الشرعیہ۔ جلد اول، ص ۳۶۲، اردو ترجمہ، قاری محمد عادل، مولانا محمد فاضل خان، قرآن کمپنی لمیٹڈ، اردو بازار، لاہور، سن اشاعت درج نہیں۔

علامہ غلام رسول سعیدی، حرمت والے مہینوں کی بابت لکھتے ہیں کہ:

عطاء نے کہا ہے کہ یہ حرمت منسوخ نہیں ہوئی، وہ اللہ کی قسم کھا کر کہتے تھے کہ لوگوں کے لئے حرم میں

اور حرمت والے مہینوں میں جنگ کرنا جائز نہیں الا یہ کہ ان کو مدافعانہ جنگ کرنی پڑے۔ اور حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حرمت والے مہینوں میں جنگ نہیں کرتے تھے الا یہ کہ آپ سے جنگ کی جائے اور آپ کو مدافعانہ جنگ کرنی پڑے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان مہینوں میں جنگ کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

اس آیت کا غیر منسوخ ہونا اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ ابن وھب نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے حضرمی کے قتل کی دیت ادا کی اور مال غنیمت اور دونوں قیدیوں کو واپس کر دیا۔ نیز اس کے بعد جو قتال کی آیات نازل ہوئیں، وہ زمانہ کے اعتبار سے عام ہیں اور یہ آیت خاص ہے، اور عام خاص کو بالاتفاق منسوخ نہیں کرتا۔ (البحر المحیط جلد ۲، ص ۳۸۲۔ مطبوعہ دار الفکر، بیروت ۱۴۱۲ھ) نیز لکھتے ہیں قاضی ثناء اللہ مظہری کے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں ہے ان کے نزدیک ان مہینوں میں ابتداءً قتال کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ مدافعانہ جنگ جائز ہے۔ (تبیان القرآن، جلد اول، ص ۸۰۲۔ ۸۰۳، فرید بک اسٹال، اردو بازار لاہور، طبع سوم، ۱۹۹۹ء) نوٹ: واضح رہے کہ علامہ سعیدی خود ان مہینوں کی حرمت کو منسوخ مانتے ہیں۔

۱۱۔ تفسیر نمونہ۔ جلد ۳، ص ۶۰۱، مصباح القرآن ٹرسٹ، الفضل مارکیٹ، اردو بازار لاہور، (بحوالہ تفسیر البرہان، جلد دوم، ص ۱۳۲)

اور علامہ سعیدی اپنی تفسیر تبیان القرآن، جلد اول، ص ۸۰۳ پر قمطراز ہیں:

''حضرت ابراہیم کے زمانے ہی سے ان مہینوں میں جنگ نہ کرنے کا دستور چلا آ رہا تھا تاکہ لوگ امن میں حج اور عمرہ کا سفر کریں۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ
حرمت اب بھی قائم ہے یا منسوخ ہو گئی''

۱۲۔ فلا تظلموا فیھن ... ای الاشھر الحرام، انفسکم ... بالمعاص فانھا فیھا اعظم وزراً ... الخ

تفسیر جلالین، ص ۱۵۸، قدیمی کتب خانہ آرام باغ، کراچی، سن اشاعت درج نہیں۔

نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں
خرد کھوئی گئی ہے چار سو میں
نہ چھوڑ اے دل فغانِ صبحگاہی
اماں شاید ملے اللہ ہو میں

اسلامی نظام خلافت کے امتیازات

محمد اعظم سعیدی
مہتمم جامعہ ورے وال، کراچی

جامعہ نصرۃ العلوم کراچی میں ماہانہ فکری نشست منعقدہ یکم اگست ۲۰۰۲ سے قومی ادبی انعام یافتہ دانشور محمد اعظم سعیدی کا خطاب

الحمد لحضرۃ الجلالۃ والصلوۃ والسلام علی خاتم الرسالۃ۔ قال عزوجل۔ ﴿ وعد الله الذین امنو منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض الخ۔ صدق اللہ العظیم

ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی یا ایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما

مولای صل وسلم دائما ابدا
علی حبیبک خیر الخلق کلھم

امابعد! محترم المقام والاحترام، رفیع الشان والاحتشام، ذوی الصائب والافہام، ذی وقار علماء کرام، مفکرین عظام، سامعین انام ۔۔۔۔۔۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت علامہ مولانا مفتی محمد الیاس صاحب رضوی زید مجدہ کے ظل عاطفت میں جامعہ نصرۃ العلوم میں منعقدہ ماہانہ فکری نشست میں آج کا موضوع سخن ''اسلامی نظام خلافت کے امتیازات'' ہے۔ مجھے اپنی علمی کم مائیگی کا مکمل ادراک ہے اور پھر ارباب فکر ونظر، اصحاب علم ودانش اور ارباب عمل کی موجودگی میں لب کشائی میرے لیے اگرچہ بہت ہی مشکل امتحان ہے مگر انہی حضرات کی حوصلہ افزائی اور دعائیں میری مشکل کشائی کریں گی۔ اب اس امید کے ساتھ گفتگو کا آغاز کر رہا ہوں کہ اگر کہیں زبان لڑکھڑا جائے یا بیان گڑبڑا جائے تو اہل علم مجھے مشق تنقید اور نشان تضحیک بنانے کے بجائے میری رہنمائی فرمائیے گا۔

معزز سامعین گرامی! اسلامی نظام خلافت کے امتیازات نہ تو اتنے محدود ہیں کہ انہیں حیطۂ تحریر یا احاطۂ حصر و شمار میں لایا جاسکے اور نہ ہی غیر معروف ہیں کہ انہیں اجاگر کرنے کی ضرورت محسوس ہو۔ اگر دنیا کے ماضی و حال کے دیگر نظاموں اور خلافت اسلامیہ کے نظام میں تقابل و موازنہ کیا جائے تو میرا یہ ایمان ہے کہ خلافت اسلامیہ کے نظام کی ہر ایک دفعہ، ہر ایک حکم، ہر ایک فعل ممتاز و اشرف ہے۔ خلافت اسلامیہ کا نظام، خواہ قیام امن و امان ہو یا عدل و انصاف ہو، حق حیات ہو یا حقوق کی مساویانہ تقسیم ہو، رواداری ہو یا دوسرے کے حقوق کی پاسداری ہو، مسلم کے حقوق و حاجات ہوں یا غیر مسلم ذمی کے حقوق و ضروریات ہوں، جان و مال کا تحفظ ہو یا حق خود اختیاری ہو، مساجد کی حرمت ہو یا غیر مسلم معابد کی حفاظت و حرمت ہو، یہ نظام ہر حوالے سے بے مثال ہے اور وہ بھی ایسا کہ دنیا کا کوئی بھی نظام اس کا مد مقابل نہیں ہے۔ گویا اسلامی نظام خلافت بالمقابلہ اشرف و ممتاز ہے اور اسی پر ہمارا ایمان و کامل ایقان ہے اسلئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ آفاقی نظام ہے۔ بایں ہمہ محض تفہیم اور قلبی تسکین کے لیے چند باتیں گوش گذار کرتا ہوں۔

نظام سلطنت:

پہلے تو یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے کہ حکومت و سلطنت کی اساس دو نظاموں پر قائم ہے ایک انسانی نظام، دوسرا الٰہی نظام۔۔۔۔ اور اس حقیقت سے بھی انکار ناممکن ہے کہ ہر قوم، ہر مذہب اور ہر جماعت قیام حکومت پر مجبور ہے، اس لیے کہ قومی یا قومتی زندگی میں، یا سماج کے ملے جلے معاشرے میں جب کوئی فتنہ و مخاصمت سر اٹھائے، یا کوئی ناہمواری کا مسئلہ پیش آئے تو اسے حکومت کے ذریعے حل کیا جائے، چونکہ انسانی طبائع مختلف ہیں، ہر آن فتنہ و فساد، جنگ و جدال کا خطرہ رہتا ہے، اگر کوئی ایسا نظام حکومت نہ ہو جو اس طرح کے سانحات و حوادثات کی روک تھام کر سکے اور مشاجرات کے فیصلے کر سکے تو نوع انسانیت کا کوئی بھی فرد اطمینان کا سانس نہ لے سکے۔

انسانی قانون:

انسان کا بنایا ہوا نظام نہ خامیوں سے مبرا ہوتا ہے اور نہ کمزوریوں سے محفوظ ہوتا ہے، اس لیے کہ قانون ساز جماعت یا کونسل تمام انسانوں کے جذبات و میلانات، ترجیحات و خیالات اور مسائل و حاجات سے کما حقہ واقف نہیں ہوتی اور نہ ہی عواطف و عواقب اور تصورات سے آگاہ ہوتی ہے، پھر قانون ساز کونسل کے اپنے ذاتی رجحانات بھی ہوتے ہیں اس لیے جب انسان قانون بناتا ہے تو اس میں حسب گنجائش اپنے نظریات کی رعایت ضرور کرتا ہے، کبھی قومیت و نسل پرستی کی بنیاد پر، کبھی سرمایہ داری و غربت کے نام پر، کبھی دین و عقیدے کی بنیاد پر قانون میں لچک پیدا کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان اپنی طویل ترین تاریخ میں آج تک جامع اور ہمہ گیر قانون نہیں بنا سکا اور نہ ہی کوئی ایسا نظام وضع کر سکا ہے، بلکہ اسے بار بار اپنے قانون کو کبھی توڑنا پڑا، کبھی بدلنا پڑا اور کبھی ختم کرنا پڑا۔ انسان نے کئی دساتیر و نظام اور ازم متعارف کرائے ہیں، جیسے نیو ازم، جین ازم،

بدھسٹ ازم، گاندھی ازم، مارکس ازم، ماؤ ازم، سوشل ازم، نیشنل ازم، سیکولر ازم، کمیونزم، کیپٹل ازم اور جمہوریت وغیرہ کو متعارف کرایا مگر ان میں سے کوئی ایک نظام بھی نوع انسانیت کو مکمل اطمینان و سکون اور امن و سلامتی مہیا نہ کر سکا، بلکہ ان میں سے اکثر نظام اپنی موت آپ مر چکے ہیں اور باقی حالت سکرات میں ہیں پھر انسانی جماعت کے وضع کردہ نظام میں نہ مکمل انصاف ہوتا ہے اور نہ ہر فرد معاشرہ کی پاسداری و رعایت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ قانون کا جو مفہوم کمزور و محکوم کے لیے ہوتا ہے وہی مفہوم طاقتور و حاکم کے لیے نہیں ہوتا۔ انسانی وضع کردہ قوانین میں چونکہ نہ حقیقی عدل کی روح ہوتی ہے اور نہ انصاف میں سچائی و مساوات ہوتی ہے اس لیے یہ قانون مفاسد و فتن کا مجموعہ بن جاتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حقیقی عدل و امن کے لیے انسان نے اجتماعی طور پر کتنی کاوشیں کی ہیں اور اس کے لیے کتنی بین الاقوامی تنظیمیں اور ادارے قائم کیے ہیں جیسے سلامتی کونسل، یو این اے، انٹرنیشنل آرمی پلان، ورلڈ پیس کونسل، عالمی امن کانگریس، رشین امن مہم، امریکن امن بریگیڈ، یوسف ازم، ورلڈ پیس موومنٹ وغیرہ ہم، مگر ان سب اداروں کے پس پردہ انسان اپنی ذاتی ترجیحات کا قیدی نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان تمام تحریکوں اور اداروں کے ہوتے ہوئے پھر بھی دنیا نے دیکھا کہ انسانوں کو دو عالمی تباہ کن جنگوں یعنی فرسٹ ورلڈ وار (۱۹۱۴ء) اور سیکنڈ ورلڈ وار (۱۹۳۹ء) سے دوچار ہونا پڑا۔

الٰہی قانون:

انسان کے وضع کردہ نظام سلطنت کے مقابلے میں دوسرا نظام سلطنت، نظام الٰہی ہے جسے خلافت یا اسلامی حکومت سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان قوانین کی وضع و ساخت میں انسانی جماعت کا کوئی کردار یا عمل دخل نہیں ہے، یہ قانون اس احکم الحاکمین کا وضع کردہ ہے جو جملہ کائنات و ما فیہا کا خالق و مالک ہے اور ہر ایک شے کے قیام و قوام اور اس کی نشو و نما میں اسی کا قانون فطرت کارفرما ہے۔ علم الٰہی چونکہ تمام تر کائنات و ما فیہا کو محیط ہے، وہ عرش علی سے تحت الثریٰ تک اور ہر آن سے ابد الآباد تک ایک ایک ذرہ کی خبر رکھتا ہے، اس لیے اپنے ذاتی، ازلی اور دائمی علم کے باعث اس کا وضع کردہ قانون سب کے مزاج، خیالات، فطرت اور تمام کائنات کے حالات کے عین مطابق ہے لہٰذا قوانین الٰہی ہر چیز اور ہر آدمی کے لیے موافق و مفید ہیں۔

انسان کو اس کائنات میں اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے، اسے عقل و فہم، اختیار، ادراک اور عزم صمیم جیسی دولت سے سرفراز فرمایا گیا ہے، اسے شمس و قمر کی تسخیر کی نوید سنائی گئی ہے، بحر و بر کو اس کی جولان گاہ بنایا گیا ہے، اسے ستاروں پر کمند ڈالنے کی ہمت سے نوازا گیا ہے۔ بایں ہمہ ممکن تھا کہ انسان اپنے ارادے اور اختیار سے غلط یا منفی کام لے اور اس کا یہ اختیار دوسرے کمزور انسانوں کے لیے جبر و وبال بن جائے تو اس کی روک تھام کے لیے اسلامی خلافت و حکومت میں قوانین سلطنت کی ضرورت ناگزیر ہوتی ہے تاکہ کوئی بھی طاقتور یا حکومتی نمائندہ

لوگوں پر جور و جبر نہ کر سکے۔ حدودِ سلطنت میں امن و امان برقرار رہے اور ہر انسان اپنے حقوق سے مکمل طور پر مستفید ہو سکے۔

اسلامی نظام خلافت کا مقصد:

اسلامی نظام خلافت کا اولین مقصد یا مطمحِ نظر دنیا کی بے وقعتی و بے ثباتی کو ذہنوں میں جاگزیں کر کے رعایا کو یہ ترغیب و ترہیب دی جاتی ہے کہ وہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دیں، یعنی اسلامی نظام حیات میں نہی عن المنکر سے پہلے، اس فعلِ منکر کے اُخروی نقصانات ذہنوں میں راسخ کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح امر بالمعروف سے پہلے عملی طور پر اس فعلِ معروف کے اُخروی فوائد سے آگاہ کیا جاتا ہے، گویا اسلامی نظام خلافت میں تبلیغ و ترغیب اور ترہیب کو اولیت حاصل ہے اور ارکانِ سلطنت کی سطح سے انہی تینوں عوامل کے ذریعے لوگوں کو سرکشی و بے راہ روی سے روکا جاتا ہے، اگر یہ تینوں طریقے کارگر نہ ہوں اور معاشرہ قوانینِ الٰہی سے بغاوت پر سر ابھارے یا گمراہی کی طرف دوڑے تو خلافت اسلامیہ اس نازک موقعہ پر قانون سے کام لیتی ہے، پھر اس حوالے سے معافی کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، کیونکہ اسلامی نظام خلافت، نام ہی اس پورے نظام سلطنت پر عمل پیرا ہونے کا ہے جسے نوعِ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے اللہ تعالیٰ نے وضع فرمایا اور اس کے رسول برحق ﷺ نے نافذ فرمایا ہے، جسے خلافت اسلامیہ علیٰ منہاج النبوۃ بھی جاری رکھتی ہے۔ گویا یہ مسلّم حقیقت ہے کہ اسلامی نظام خلافت سراسر دینی و ربانی نظام حکومت ہے، جس کے قوانین کی ترتیب و تدوین میں انسان کا کوئی کردار نہیں ہے۔ یعنی اسلامی نظام خلافت میں انسان صرف قانونِ الٰہی نافذ کرتا ہے، اپنی طرف سے کوئی قانون وضع نہیں کرتا۔

امتیازی شان:

مذکورہ حقیقت کی بنا پر اسلامی نظام خلافت کی یہ امتیازی شان ہے کہ یہ ہر انسان کو امن و عافیت کی مضبوط و مکمل ضمانت دیتا ہے، جس طرح اندرونِ ملک افراد کو ہر طرح سے تحفظ فراہم کرتا ہے اسی طرح خارجی تعلقات میں بھی ایفائے عہد اور ان کے تشخص کو قائم رکھنے کی ضمانت دیتا ہے۔۔۔۔۔ اس نظام میں انسانی وحدت، مساوات، باہمی تعاون، انسان نوازی، انسانی ہمدردی، حسنِ سلوک، صلح جوئی، ایثار و اخلاص، رواداری، فیاضی، شرافتِ انسانی، عفو و درگذر، حریتِ فکر، عدل و انصاف، معاہدات کی پاسداری، اخوت، مروت و محبت کو جزوِ لازم کی حیثیت دی گئی ہے اسی طرح کے دیگر قوانین بھی ہیں کہ جس کی مختصر تعبیر "اسلامی نظام خلافت" یا "آئینِ حکومت ربانی" ہے۔

یہ نظام بزورِ شمشیر، طاقت کے بل بوتے پر محض اجسام و اعناق پر حکمرانی کا قائل نہیں بلکہ یہ سب سے پہلے دلوں میں خوفِ خدا، فکرِ آخرت اور انجامِ بخیر کا عقیدہ راسخ کر کے حاکم و رعایا کو ایک ہی گلدستہ میں سجا دیتا ہے۔

اسلام کے نظام خلافت میں کبر و غرور، دولت و طاقت، ملکی، نسلی، قومی، ملی، قومیتی عصبیت اور حبِ جاہ و اقتدار کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ یہ نظام جنس و ملک، زبان و بیان اور شعوب و قبائل کے اختلاف کو وجہ تفریق و تقسیم نہیں بناتا، بلکہ ایسے تمام وجوہات و لوازمات کو مظاہرِ قدرت اور اسبابِ تعارف و ذرائع شناخت بتاتا ہے اور شرف و امتیاز کا معیار صرف خدا ترسی اور پرہیزگاری کو قرار دیتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

ومن ایاته خلق السمٰوٰت والارض واختلاف السنتکم والوانکم ، ان فی ذالک لایات للعلمین۔

اور اسکی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف ہے، بیشک اس میں عالمین (عقلمندوں) کے لیے نشانیاں ہیں۔ (الروم)

جینے کا حق اور فرد کی حفاظت:

اسلامی نظام خلافت میں خلیفۂ وقت یا حکومت کے احکامات و عملی اقدامات کا بنظر غائر اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ یقین آ جاتا ہے کہ خلافت اسلامیہ کا ہر امر و فعل از خود ممتاز ہے، اور یہ عقیدہ حق الیقین کا درجہ حاصل کر لیتا ہے کہ دنیا کے تمام نظاموں میں اسلامی نظام خلافت کو مکمل امتیاز و تفوق حاصل ہے، بایں ہمہ اسلامی نظام خلافت میں میرے نزدیک اہم ترین امتیاز بلا تفریق دین و مذہب، رنگ و نسل، عربی و عجمی فرد کی مجموعی حفاظت اور اسے جینے کا حق دینا ہے۔

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کی نظر میں شرک سب سے بڑا گناہ ہے، جرائم میں سب سے بڑا جرم اور مظالم میں سب سے بڑا ظلم ہے خود رب العلمین نے اسے ظلم عظیم قرار دیا ہے (ان الشرك لظلم عظيم) مگر اللہ تعالیٰ نے اس ظلم عظیم کی کوئی سزا دنیا میں تجویز نہیں فرمائی، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس ظالم مشرک کو فوراً قتل کر دینے، اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دینے، یا اسے تختۂ دار پر لٹکانے کا حکم نہیں دیا، بلکہ اسے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے زندہ رہنے اور زندگی گذارنے کا پورا حق دیا جاتا ہے اور اس کی ضروریات و حاجات اسی طرح پوری کی جاتی ہیں جیسے فرمانبردار و اطاعت شعار بندوں کی حاجات و ضروریات پوری کی جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ کی نعمتیں پانی، آگ، ہوا، سورج، چاند، زمین، آسمان، صحت و تندرستی، عقل و فہم، قوائے جسمانی، حواسِ خمسہ، اعضاء و جوارح، راحت و لذت، بحر و بر، اور کائنات کا ذرہ ذرہ بلا تفریق مذہب و دھرم، رنگ و نسل ہر فرد کے لیے عام ہیں۔ اسی طرح اسلامی نظام خلافت میں امن و امان، سکون و اطمینان، اور جینے کا حق ہر ایک کے لیے ہے، دین و عقیدے کا تعلق از قبیل اختیار ہے، "لا اکراہ فی الدین" دین کے معاملے میں کوئی جبر و دباؤ نہیں ہے، باوجودیکہ اللہ تعالیٰ کا محبوب و مرغوب دین اسلام ہے "ان الدین عند اللہ الاسلام" یعنی کفر و شرک کی آمیزش والا یا تحریف شدہ کوئی دین اسے پسند نہیں ہے لیکن بایں ہمہ اسلامی نظام خلافت میں جینے اور زندگی گذارنے کے حق میں کوئی تفریق نہیں

Seminar Library

ہے اسی طرح حقوق و معاملات، تحفظ جان و اسباب سب کے لیے یکساں ہے، مذہبی آزادی، اظہار خیال کی آزادی اور اختیار کی نعمت سب کے لیے ایک جیسی ہے۔

اسلامی نظام خلافت کو سمجھنے کے لیے خلافت راشدہ کے عہد کا مطالعہ کیا جائے تو یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ خلافت اسلامیہ اپنے عہد خلافت میں ہر فرد کو جان کی حفاظت، مال کی حفاظت، عقل و عقیدے کی حفاظت، عزت و عصمت کی حفاظت، مساجد و معابد کی حفاظت اور دین و مذہب کی حفاظت کی ضمانت دیتی ہے، اپنے مفتوحہ علاقوں میں کلیسا، صومعہ، آتش کدہ، مندر، گوردوارہ کی حرمت کا پاس رکھتی ہے یعنی اپنی حدود سلطنت میں خلافت اسلامیہ فرد کو نہ جسمانی آزار پہنچاتی ہے نہ روحانی، جیسا کہ یورپی مصنف و مورخ گستاؤلیبان لکھتے ہیں۔

خلفائے اسلام نے واضح فرمان جاری کر دیا تھا کہ اقوام مفتوحہ کے مذاہب و رسوم اور ثقافت و آثار کی مکمل حفاظت و حرمت کی جائے گی، البتہ اس مذہبی و شخصی اور اختیار و ارادے کی آزادی اور جان و اسباب اور معابد و آثار کی حفاظت کے بدلے میں ان سے انتہائی معمولی و خفیف سا خراج "جزیہ" لیا جائے گا جو ان مطالبات و مطلوبات سے بہت ہی کم تھا جو ان اقوام کے سابقہ حکمران، ان سے وصول کیا کرتے تھے (بحوالہ تمدن عرب)

یہی ڈاکٹر لیبان مزید لکھتے ہیں۔۔۔ خلفائے اسلام نے اپنی رعایا کے ساتھ نہایت انصاف و انسانیت کا برتاؤ کیا اور انہیں مذہب کی پوری آزادی دی، ان کے عہد میں مشرقی اور مغربی کلیساؤں کے اساقفہ کو جتنا سکون و اطمینان ملا اس سے پہلے نہیں ملا تھا۔۔۔ علاوہ ازیں بیت المقدس کی فتح کے وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منادی کرا دی کہ اس شہر کے باشندگان کے جان و مال کی حفاظت کا میں ذمہ دار ہوں، ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی جائے گی۔ اور مسلمان، عیسائیوں کے کلیسا اور یہودیوں کے صومعہ میں نماز پڑھنے کے مجاز نہ ہوں گے۔ (ترجمہ بحوالہ تمدن عرب)

ایک غیر مسلم نقاد و مورخ جس حقیقت کا اعتراف کر رہا ہے تو کیا خلافت اسلامیہ کی ایسی حکمرانی لوگوں کے لیے رحمت نہیں ہے کہ جس کے زیر سایہ نوع انسانیت کو چاہے وہ عیسائی ہوں یا یہودی، پارسی ہوں یا مجوسی، بت پرست ہوں یا سکھ، جین مت ہوں یا بدھ مت، سب کو آرام و سکون کی زندگی نصیب ہوتی ہے۔

قوانین ربانی کا نفاذ:

خلافت اسلامیہ کا ایک بڑا امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ انسان کے وضع کردہ قوانین کے بجائے اللہ رب العلمین کے قوانین کو نافذ کرتی ہے جس میں نہ افراط و تفریط ہوتی ہے۔ نہ ظلم و جبر ہوتا ہے اور نہ ہی افراد و رعایا میں کوئی تفریق و امتیاز ہوتا ہے، جو قانون گدا کے لیے ہوتا ہے وہی بادشاہ کے لیے ہوتا ہے جو آجر کے لیے ہوتا ہے وہی اجیر کے لیے ہوتا ہے جو فقیر کے لیے ہوتا ہے وہی امیر کے لیے ہوتا ہے جو تنگدست کے لیے ہوتا ہے وہی فراخ

دست کے لیے ہوتا ہے جو مسلم کے لیے ہوتا ہے وہی غیر مسلم ذمی کے لیے ہوتا ہے جو قانون اپنوں کے لیے ہوتا ہے وہی غیروں کے لیے بھی ہوتا ہے یہ ہے اسلامی نظام خلافت کا امتیاز کہ معاشرے کے ہر فرد کے لیے یکساں پالیسی اور یکساں قانون ہوتا ہے اور یہ قانون بھی انسانی نہیں ربانی ہوتا ہے۔

یہ ناممکن ہے کہ خلافت اسلامیہ اپنے مکمل نظام و قوانین کے ساتھ موجود و قائم ہو اور پھر ریاست میں بدنظمی و بدانتظامی، انتشار و وحشت، بے چینی و بے اطمینانی بھی ہو، اسلامی نظام خلافت میں فتنہ و فساد، قتل و غارتگری، قزاقی، قبضہ گیری، استحصال و استیصال جیسی کوئی برائی نہیں پنپ سکتی اور نہ ہی ایسی کوئی اسکیم کامیاب ہو سکتی ہے۔ یہ نظام، افراد و حکومت کے لیے امن و امان اور سلامتی کا انتظام کرتا ہے اور ملک و رعایا کے لیے بھی کرتا ہے، گویا انفرادی و اجتماعی یعنی ایوان اقتدار کے ارکان اور رعایا کو ہر حوالے سے بحیثیت انسان جینے کا حق اور پر امن زندگی بسر کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس لیے خلافت اسلامیہ اپنے نظام کے مطابق ایسے تمام عوامل پر قانون کا پہرہ بٹھا دیتی ہے جو انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے مہلک و مضر ہوں، یعنی اخلاق و اعمال کی راہ سے بھی اور عقائد و معاملات کی راہ سے بھی کوئی ایسا گوشہ نہیں چھوڑا جاتا جس کے لیے باضابطہ قانون موجود نہ ہو۔ کیونکہ خلافت اسلامیہ میں جب عقائد کی پختگی حاصل ہوتی ہے تو معاملات کی درستگی و صفائی لازمی قرار دی جاتی ہے۔ جب اعمال و اخلاق درست ہو گئے تو ملک فتنہ و فساد کی گرم بازاری سے محفوظ ہو جائیگا۔

انسانی اور ربانی نظام میں امتیاز:

انسانی اور ربانی نظام حکمرانی میں جو چیز زیادہ سے زیادہ مابہ الاشتراک ہے وہ امن و امان کا قیام ہے۔ جس طرح خلافت اسلامیہ کے نظام کے لیے امن و سکون کی ضرورت ہے اسی طرح انسانی نظام حکومت میں بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر دونوں نظاموں میں بعد المشرقین ہے، کیونکہ انسانی نظام حکمرانی میں امن و امان صرف اس قدر ضروری سمجھا جاتا ہے کہ جس سے حکمران طبقے کا اقتدار قائم و برقرار رہے، ورنہ تاریخ گواہ ہے کہ حکمران بھیڑ لڑاؤ اور حکومت کرو جیسے نظام کے پشت پناہ ہوتے ہیں، ایسی حکومتیں جو پارٹی یا کسی مذہب کے نام پر قائم ہوتی ہیں یا جو بغاوت و فوج کی بناء پر حکومت بناتے ہیں وہ قصداً ملک میں فساد و غارتگری کراتے رہتے ہیں، اسکے برعکس خلافت اسلامیہ اپنے مستحکم نظام کے باعث ایک لمحہ کے لیے بھی بدنظمی، جدال و قتال اور فتنہ و فساد کو برداشت نہیں کرتی۔

انسانی نظام حکومت پر اسلامی نظام خلافت کو ایک امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ خلافت اسلامیہ ہر انسان کو بلا تفریق اس کے فطری حقوق بخشنے اور حقیقی عدل و مساوات قائم کرنے کے لیے قائم ہوتی ہے اور اس کا خاص مشن ظلم و زیادتی کو روکنا ہوتا ہے، جبکہ انسانی حکومت عام طور پر کسی طاقتور شخص یا خاندان یا ایک مخصوص پارٹی یا قوم و قبیلے کے اغراض و مقاصد پورے کرنے کے لیے وجود میں آتی ہے، اور اس کا منشاء و مشن مد مقابل کمزور افراد،

جماعتوں، خاندانوں، قوم قبیلوں کو پایا اور اطاعت گذاری پر مجبور کرتا ہوتا ہے۔

خلافت اسلامیہ کی برکات:

یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام خلافت کی برکات سے پورا ملک اور سارے لوگ خوش وخرم رہتے ہیں۔ جان ومال، عزت وآبرو کو محفوظ پا کر چین کی نیند سوتے ہیں، ہر آن باران خیر وبرکت سے لطف اندوز ہوتے اور راحت ولذت حاصل کرتے رہتے ہیں، اس نظام حکمرانی میں نہ کوئی فقر وفاقہ کی زنجیروں میں جکڑا ہوتا ہے اور نہ ظلم وتعدی کی چکی میں پس رہا ہوتا ہے اور نہ کوئی جور وجبر کا تختہ مشق بنتا ہے اور نہ ہی کسی جابر وظالم اور شرزہ ور کو خونخوری کا موقع دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس نظام میں قوی وضعیف کی تفریق نہیں ہوتی۔ نہ ہی خاندانی وقبائلی عصبیت کا دور دورہ ہوتا ہے اور نہ ہی غریب ونحیف کسی شہزور انسان کی غلامی، پوجا اور خوشامد پر مجبور ہوتا ہے۔

اس کے برعکس انسان کے وضع کردہ نظام حکمرانی میں امتیازی سلوک کا قانون نافذ ہوتا ہے۔ کسی کے لیے بحیثیت ظالم زندگی گذارنا روا ہوتا ہے تو کوئی مظلوم بن کر زندگی بسر کرتا ہے، برسر اقتدار طبقہ محکوم لوگوں کی زندگی زہر کردیتا ہے، لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رہتا ہے، مختلف حیلوں بہانوں سے مخالفین کو پابند سلاسل کیا جاتا ہے، غریبوں کا خون چوسا جاتا ہے، اظہار خیال پر پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں۔ غرض کہ اس نظام میں عدل ومساوات مفقود ہو جاتا ہے، محکوم کی عزت وآن، ہر آن غیر محفوظ رہتی ہے اور جان خطرے کے نشانے پر رہتی ہے۔

اور یہ بھی اٹل حقیقت ہے کہ خلافت اسلامیہ کا نظام کسی فرد کا محتاج نہیں ہے، اس کی قانونی حیثیت اس پر موقوف نہیں ہے کہ اسے کوئی جماعت، کوئی خاندان یا ارباب شعور وادراک، یا زعمائے مملکت کی اکثریت اسے تسلیم کرے، بلکہ وہ تو ساری کائنات کے حقیقی خالق ومالک کے وضع کردہ ہونے کے باعث مسلّم ہے لہذا جو جماعت یا فرد اس سے انحراف وروگردانی کرے گا وہ عنداللہ مجرم ہوگا، اور جو عدالت اور حکام اس کے نظام عدل سے انحراف کرتے ہیں وہ عنداللہ باغی ہیں جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔

"جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ (نظام) کے موافق فیصلہ نہیں کرتے وہ فاسق ہیں۔" (سورہ مائدہ)

نیز انسانی قانون (فرد واحد کا نافذ کردہ) اس وقت تک قانون نہیں بن سکتا جب تک ایک قانون ساز جماعت اسے قبول کرکے قانون کی حیثیت سے اسکی منظوری نہ دے دے۔ یا یہ کہ کسی عدالت کی تائید وتصویب اسے حاصل نہ ہو جائے، نیز یہ قانون بھی تعظیم وتقدیس کی نعمت سے تہی دامن ہے، پھر یہ قانون جزو ایمان بھی نہیں کہ لوگ دل کی گہرائی سے اس کا احترام کریں یا عقیدت کا مرکز بنا کر اسکے گرویدہ ہو جائیں یا اپنے دل کو اس کی اتباع پر مجبور کریں اور ہر مقام وہر جگہ اس کا احترام ضروری سمجھیں۔ بلکہ انسانی قانون کی حیثیت تو یوں ہے کہ فرد کی جس حد تک ذاتی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے مانتا ہے جہاں اس کا کام رک جاتا ہے وہاں اس کی خلاف ورزی کرتا

ہے، فرد کی زیادہ سے زیادہ کوشش بس اتنی ہی ہوتی ہے کہ حکام کو اس کی خبر نہ ہو۔

اسکے برعکس خلافت اسلامیہ اپنے نظام کو چلانے کے لیے جس قانون الٰہی کو اساس بناتی ہے وہ مقدس ومحترم ہوتا ہے، جزو ایمان ہوتا ہے، ظاہری جسم کے ساتھ ساتھ قلب ودماغ بھی اس کے تابع فرمان ہوتے ہیں ہر مقام پر بلکہ ہر وقت اس کا احترام کرتے ہیں اور خود پر اس کا التزام فرض گردانتے ہیں۔ اس قانون سے سچی عقیدت رکھتے ہیں اس کی تعمیل میں رضائے الٰہی، فلاح دارین اور اخروی نجات کا صدق دل سے یقین رکھتے ہیں۔

اسلامی نظام خلافت کا استحکام:

غیر الٰہی نظام حکومت کے قوانین، بدلتے حالات اور جدید مسائل وایجادات کے تقاضوں کے پیش نظر ہر وقت بدلتے رہتے ہیں۔ کیونکہ انسان خود بھی محدود ہے اور اس کی پرواز بھی محدود ہے اس لیے انسانی قانون میں وحدت ویکسانیت نہیں ہوتی۔ مگر خلافت اسلامیہ کی طرف سے نافذ کردہ قوانین الٰہیہ ائمی ودوامی ہوتے ہیں جو جدید سے جدید مسائل کو بھی نہ صرف اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں بلکہ ان میں ایسی لچک اور وسعت ہوتی ہے کہ ہر دور میں اور ہر ماحول میں کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ کسی بھی مرحلے پر وہ انسان کو تاریکی میں نہیں چھوڑتے۔ یعنی ہر فرد ومعاشرہ کو اس کے فطری اور فطرتی حقوق مہیا کرتے ہیں۔ نیز رب العلمین کے تجویز کردہ یہ قوانین عالمگیر اور سراپا ہدایت ہونے کے باعث ان کی وحدت ویکسانیت میں کبھی کوئی فرق نہیں آتا۔

علاوہ ازیں انسانی قانون صرف چند منتخب اور سربرآوردہ افراد کی رائے سے بنتا ہے جو یقینی طور پر ملک کی ایک بڑی اکثریت کی نظر میں ناقابل اعتماد ہوتا ہے، دوم یہ کہ قابل اعتماد افراد کے تسلیم کرلینے کے باوجود بھی دوسرا انسان سوچتا ہے کہ یہ بھی ہم جیسے انسان ہی ہیں جو دنیاوی رذائل سے قطعاً پاک نہیں ہیں اس لیے یہ قانون عام افراد کی نظروں میں زیادہ وقیع نہیں ہوتا۔۔۔۔ جب کہ قانون الٰہی ان تمام عیوب وتصورات سے پاک ہے۔ خلاصہ یہ کہ خلافت اسلامیہ کا نظام ملک اور قوم کو جو تحفظ، امن وسلامتی اور سکون واطمانیت عطا کرتا ہے وہ سب قوانین الٰہیہ کا فیض ہے اور رب العلمین کے رحم وکرم کا صدقہ ہے اسی لیے یہ نظام سارے عالم کے لیے رحمت ہی رحمت ہے۔

بین الاقوامی وحدت اور عدل ومساوات:

اسلامی نظام خلافت کا ایک یہ امتیاز بھی ہے کہ وہ امن وسلامتی کا منبع ہے اور امن وسلامتی کی اساس عدل ومساوات پر قائم ہے افراد اگر عدل سے محروم ہوں اور عدم مساوات کا شکار ہوں تو انہیں امن وسکون اور اطمینان وسلامتی میسر نہیں آسکتی۔۔۔۔ اسلام کے عہد زریں سے قبل دنیا کے گوشے گوشے میں اونچ نیچ، ذات پات، شریف وکمین اور حاکم ومحکوم کی تفریق شدومد سے موجود تھی۔ اس وقت دنیا کا کوئی نظام حکومت وحکمرانی ہے

انصافی اور جور و تعدی سے پاک نہیں تھا۔ ہر قوم کبر و نخوت، اور غرور و عُجب کی دعویدار تھی۔ یہودی کہہ رہے تھے لیست النصاری علی شیء کہ عیسائی بے وقعت و لاشئی ہیں اور عیسائی کہہ رہے تھے لیست الیہود علی شیء کہ یہودی بے حیثیت و لاشئی ہیں، اس کبر و نخوت کا یہ عالم تھا کہ طاقت کے بل بوتے پر انسان، انسان کا خدا اور دیوتا بنا بیٹھا تھا، کمزوروں کو غلام بنایا جا رہا تھا، انا کی تسکین کے لیے انسانیت کو تہ تیغ کر کے مشرق و مغرب فتح کیے جا رہے تھے ایسے نازک دور میں رحمۃ للعالمین ﷺ نے عدل و مساوات اور انصاف و رواداری کی صدا بلند فرمائی اور اس امتیاز کی بیخ کنی فرمائی جو شہزور و کمزور، برہمن و شودر، آقا و غلام، شریف و کمین، سپارٹی و ہیلاط وغیرہ میں صدیوں سے قائم تھا، اسی طرح جو تفریق و تفاوت، غلو و امتیاز، عیسوی و موسوی قانون میں موجود تھا اسے بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

تاریخ عالم میں فخر و امتیاز صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے پوری قوت سے انسان کو یہ ذہن نشین کرایا کہ تمام نوع انسانیت ایک ماں باپ کی اولاد ہیں اور تم سب ایک جان سے پیدا کئے گئے ہو، اسلام نے یہ اعلان کیا کہ خاندان قبیلہ، اور ذات پات کی تقسیم صرف باہمی تعارف و شناخت کے لیے ہے، جس کی نہ کوئی قانونی حیثیت ہے اور نہ یہ وجہ فخر و امتیاز ہے، البتہ امتیاز کی چیز عند اللہ صرف تقویٰ ہے۔ جو جتنا متقی ہوگا اتنا ہی عند اللہ معزز و مکرم اور شریف شمار ہوگا۔

اور یہ بھی واضح کیا کہ ماں باپ کے لفظ سے یہ دھوکہ نہ کھانا کہ ماں اور باپ کی اصل الگ الگ ہے اور یہ بھی نہ سوچنا کہ نسل انسانی دو مادوں سے مرکب ہے یا نوع انسانیت مختلف جڑوں کی شاخیں ہیں۔ ایسی سوچ نسل انسانی کی وحدت کو پارہ پارہ کر دے گی۔ اسلام نے قلوب و اذہان میں یہ عقیدہ راسخ کیا کہ دونوں یعنی ماں اور باپ کی بنیاد ایک ہی ہے کیونکہ عورت بھی مرد یعنی تمہارے باپ ہی کی جنس سے ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ و خلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا و نساء (سورۂ نساء)

"اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی زوجہ پیدا کی، اور ان دونوں سے بیشمار مرد اور عورتیں پیدا فرمائیں"۔

رشتۂ وحدت کی اہمیت:

اس کا منشا و مقصد یہ ہے کہ دنیا کی ساری نوع انسانیت کی جڑ یا بنیاد صرف ایک ہے یعنی تمام انسان خواہ مرد ہوں یا عورتیں ایک درخت کی شاخیں ہیں جس طرح شاخوں ٹہنیوں کا ملاپ و اتصال درخت کے حسن و رعنائی میں اضافہ کرتا ہے اسی طرح تمام نوع انسانیت کا باہمی میل جول اور رشتہ شجر انسانیت کو خوبصورت اور

اطمینان وسکون کی نعمت سے سرفراز کرے گا۔ گویا اسلامی نظام خلافت کا منشا ہی یہ ہے کہ نوع انسانیت میں بحیثیت انسان تفریق نہ ہو، ان میں انتشار و افتراق نہ ہو، مسائل و معتقدات، جدائی کا سبب نہ بنیں بلکہ سب مل کر زندگی بسر کریں، باہم ذکر اخوت و رواداری کا سلوک رکھیں اور نفرت و عداوت کے بیج کو اپنے دل و دماغ سے نکال باہر کریں یہ نظام خلافت علی منہاج النبوۃ ہی ہے جو تمام انسانوں کو مل جل کر رہنے کا سبق دیتا ہے جیسے کہ ایک باپ کی اولاد بھائی بھائی بن کر رہتی ہے۔ سورۂ نساء میں ارشاد الٰہی کا یہی تقاضہ ہے کہ انسان کسی بھی حالت میں باہمی تعلق کو فراموش نہ کرے جس طرح سگے بھائی اپنے رشتہ کا لحاظ و پاس فرض سمجھتے ہیں اسی طرح حضرت آدم کے سارے بیٹے بھائی بن کر رہیں۔ انسان اگر قدرت و فطرت کے قائم کردہ اس فطری رشتے پر غور کرے اور ارشاد باری تعالیٰ واتقو اللہ الذی تساء لون بہ والارحام ان اللہ کان علیکم رقیبا (اور اے لوگوں اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے مطالبہ کرتے ہو، اور قرابت کے رشتے کو توڑنے سے پرہیز کرو، بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے احوال کا نگران ہے) پر ایمان لے آئے تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ دنیا میں موجود انتشار، افتراق، بے چینی، بے اطمینانی، خوف، مار دھاڑ ختم ہو جائے گی۔ مگر اس قدرتی رشتہ کی قدر نہ کل تھی نہ آج ہے، ان آیتوں میں جب سارے انسانوں کی بنیاد ایک فرد کو قرار دیا گیا ہے تو یہیں سے یہ بات اظہر من الشمس ہوئی کہ سارے انسان بحیثیت انسان معاشرتی طور برابر ہیں اور اللہ تعالیٰ انسانی برادری میں مساوات برقرار رکھنا چاہتے ہیں اس لیے نسل و نسب کی بحث کا خاتمہ ضروری ہے۔

احادیث اور رشتۂ وحدت:

مذکورۃ الصدر موقف کی تائید درج ذیل احادیث سے ہوتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔

۱۔ "ان اللہ اذھب عنکم عصبیۃ الجاھلیۃ وفخرھا بالآباء" "یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں طور پر جاہلیت کی عصبیت اور باپ دادا پر فخر کرنے کو تم سے مٹا چکے ہیں۔ (مشکوٰۃ شریف)

۲۔ "الناس کلھم بنو آدم و آدم من تراب" سارے لوگ آدم کے بیٹے ہیں اور آدم کی پیدائش مٹی سے ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

۳۔ "انسابکم ھذہ لیست بمسبۃ کلکم بنو آدم" "تمہارے یہ انساب عار نہیں تم سب آدم کے بیٹے ہو۔ (مشکوٰۃ شریف)

۴۔ "الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الیٰ عیالہ" "تمام مخلوق خدا کی عیال ہے لہٰذا جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے حسن سلوک سے پیش آئے گا وہی محبوب خدا ہوگا۔ (مشکوٰۃ: باب الشفقۃ)

۵۔ "لیس منا من دعا الی عصبیۃ ولیس منا من قاتل عصبیۃ ولیس منا من مات علی عصبیۃ" "جو عصبیت کی دعوت دے وہ ہم میں سے نہیں، جو عصبیت کے باعث جنگ کرے وہ

ہم میں سے نہیں اور جس کی موت عصبیت پر واقع ہوئی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (مشکوٰۃ باب الجنائز)

بہر حال جو آیات اور احادیث پیش کی گئی ہیں وہ وحدت انسانیت کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔ ان تمام احادیث و آیات میں خطاب عام ہے جو جملہ نوع انسانیت کو شامل ہے اس میں بلا تفریق تمام قومیں آجاتی ہیں اور یہی اسلامی نظام خلافت کا منشاء ہے کہ تمام انسان مل جل کر محبت بھری زندگی گذاریں، اپنے اپنے مذہب و عقیدے پر قائم رہتے ہوئے صلہ رحمی کو قائم رکھیں۔ عداوت، نفرت اور بغض و حسد کو اپنے دلوں میں جگہ نہ دیں۔

غرض کہ اسلامی نظام خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں جغرافیائی بنیاد پر رنگ، نسل، خاندان اور مذہب و فرقہ کی بنیاد پر نوع انسانیت میں تفریق کی گنجائش نہیں ہے۔ جب سب انسان ایک ہی باپ کی اولاد ہیں تو پھر کسی کو کب زیب دیتا ہے کہ وہ رنگ و نسل یا ملک و ملت پر فخر کرے البتہ ذاتی اوصاف و کمالات اس لائق ہیں کہ وہ باعث شرف و امتیاز بن سکتے ہیں۔

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکر فردا نہ کروں، محو غم دوش رہوں
تھی تو موجود ازل ہی سے تری ذات قدیم
پھول تھا زیب چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
مئے توحید کو لے کر صفت جام پھرے
تو جو چاہے تو اٹھے سینہ صحرا سے حباب
رہرو دشت ہو سیلی زدہ موج سراب

نام۔ جاہلی تمدن اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالشہید نعمانی

سابق چیئرمین، شعبہ عربی، جامعہ کراچی

اسلام دین فطرت ہے۔ اس نے جو نظام حیات عطا کیا ہے وہ کسی ایک دائرے تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہے۔ سیاست ہو یا معیشت، معاشرت ہو یا عائلی زندگی، کون سا شعبہ ایسا ہے جس میں واضح رہنمائی موجود نہیں۔ احادیث میں کتاب الادب کے تحت مستقل ابواب ہیں جن میں انسانی زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کے بارے میں تفصیلی ہدایات ملتی ہیں۔

ان ہی جزئیات میں ایک "نام" بھی ہے۔ ہر انسان کی اس دنیا میں آمد کے بعد اس کے تشخص کا پہلا ذریعہ اس کا نام ہے۔ نام سے ہی وہ پہچانا جاتا ہے۔ معاشرے میں تعارف حاصل کرتا ہے اور دیگر بنی نوع انسان کے مقابلے میں ایک امتیاز اور انفرادیت پاتا ہے۔

عربی میں نام کے لیے لفظ "اسم" استعمال ہوتا ہے جس کی جمع "اسماء" آتی ہے۔ "اسم" اور "اسماء" ہمارے یہاں اردو میں بھی اسی معنی میں رائج اور مستعمل ہیں۔ عربی زبان میں اسم کا مفہوم کیا ہے اور وہ کن معنوں میں بولا جاتا ہے اس کے لیے ہمیں لغت سے رجوع کرنا ہوگا۔

امام راغب اصفہانی اسم کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"اسم وہ ہے جس سے کسی چیز کی ذات کا تعارف حاصل ہو"۔

علامہ قسطلانی نے المواہب اللدنیہ میں اسم کی تعریف درج ذیل الفاظ میں کی ہے۔

"اسماء اسم کی جمع ہے اور اسم وہ کلمہ ہے جس کو عرب ایک مخصوص ہستی کے لیے بولتے ہیں کہ جب وہ لفظ ادا کیا جائے تو ذہن اس مخصوص ہستی کی طرف منتقل ہو جائے"۔

ہر قوم کا بچوں کے نام تجویز کرنے میں اپنا ایک خاص ذوق ہوتا ہے جس میں تمدنی، معاشرتی اور دیگر بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔

زمانہ جاہلیت کے عربوں کی زندگی پر وہاں کی مخصوص آب و ہوا اور موسم کا بہت اثر تھا۔ قریش اور قحطانیوں کو چھوڑ کر بقیہ عرب کے باشندے خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے۔ خیموں میں رہتے اور مویشی پال کر ان کے دودھ اور گوشت سے پیٹ بھرتے اور سبزہ زاروں، بارانی علاقوں، چشموں اور کنوؤں کی تلاش میں مستقل گردش کرتے رہتے۔ اسباب رزق کی کمیابی کی وجہ سے آئے دن قحط سے دوچار ہوتے اور ایسی صورت حال میں ایک دوسرے کا مال و اسباب لوٹنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ زبان دانی پر وہ فخر کرتے، اولاد نرینہ کو پسند کرتے اور لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے۔ ان کی ساری زندگی مذکورہ صفات کے اردگرد گھومتی تھی۔ ان کے ناموں کی روشنی میں ان کی تمدنی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس میں بھی جنگ و جدال، باہمی آویزش اور فخر و مباہات کے اثرات بہت نمایاں طور پر موجود ہیں۔ چنانچہ وہ دشمن پر غلبہ، فتح اور نصرت کا شگون حاصل کرنے کے لیے اپنے بچوں کے ایسے نام تجویز کرتے تھے جن میں فتح و نصرت، غلبہ و انتقام، بیداری، چوکسی اور بہادری کا پہلو نکلتا ہو، جیسے: غالب (غلبہ حاصل کرنے والا)، غلاب، ظالم، عارم (بدخلق، متشدد)، منازل (مدمقابل)، مقاتل (جنگجو)، ثابت (ثابت قدم)، مسہر (بیدار)، مؤرق (بیدار)، حذر (ہوشیار)، صبح (صبح آنے والا)، طارق (رات کو آنے والا)، عباس (ترش رو شیر)، ضرار (ضرر رساں)، حمزة (تیز اور شعلہ بار شیر)، مصعب (دشوار، سرکش)۔

اسی طرح دشمنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی اولاد کے نام درندوں اور وحشی جانوروں کے نام پر رکھتے اور یہ توقع کرتے کہ وہ دشمنوں کے بالمقابل وحشی درندے ہی ثابت ہوں گے اور دشمن سے انتقال لینے میں ان صفات کا مظاہرہ کریں گے جو وحشی درندوں کا خاصہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہمیں اس قسم کے نام بکثرت ملتے ہیں: اسد (شیر)، لیث (شیر)، فراس (چیر پھاڑ کرنے والا)، ذئب (بھیڑیا)، ضرغام (شیر)، کلب (کتا)، فہد (تیندوا)۔

اسی جنگجو طبیعت کے زیر اثر وہ بچوں کے نام ایسے درخت اور پودوں کے نام پر بھی رکھتے تھے جو کانٹے دار، کڑوے، کسیلے اور غیر نفع بخش ہوں۔ ان ناموں میں ان کا مقصود اپنی قوت و شوکت کا اظہار کے ساتھ یہ تاثر بھی پیدا کرنا تھا کہ ان کی اولاد پر غلبہ و فتح حاصل کرنا دشمن کے لیے اتنا ہی دشوار ہوگا جس طرح ان درختوں اور پودوں سے نفع حاصل کرنا دشوار ہوتا ہے اور یہ کہ ان کی اولاد ان ضرر رساں پودوں کی طرح دشمن کے لیے سخت خطرے اور نقصان کی باعث ہوگی۔ اس قسم کے ناموں میں درج ذیل نام بہت نمایاں ہیں: مثلاً عضاہ (کانٹے دار جھاڑی)، قرظ (کیکر سے مشابہ ایک درخت)، طلحہ (کانٹے دار درخت)، سمرة (کانٹے دار جھاڑی یا درخت)، قتادہ (سخت کانٹے والا درخت)، ہراسة (کانٹے دار درخت)۔

اسی طرح وہ سختی، درشتی اور انتہائی عزم و ہمت کے اظہار کے لیے اپنی اولاد کے نام زمین کے ایسے قطعات کے نام پر رکھتے تھے جن میں بلندی، سختی اور شوکت و عظمت پائی جاتی ہو اور یہ فرض کرتے کہ ان کی اولاد کو زیر کرنا اسی طرح مشکل ہوگا جس طرح اس قسم کے قطعات اراضی کو سر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ جیسے: حجر (پتھر)، حجیر

(چھوٹا پتھر)، صخر (چٹان)، فہر (سخت پتھر)، جندل (بڑی چٹان)، جرول (پتھریلی زمین)، حزن (سخت زمین)، حزم (سخت اور بلند زمین)

بچوں کے نام تجویز کرنے میں ایک پہلو جو نمایاں طور پر ہمیں نظر آتا ہے، وہ یہ ہے کہ عرب لوگ ناموں میں ایسے مفہوم کا اظہار چاہتے تھے جس میں کامیابی، کامرانی، آبادی، فلاح اور حصول مقصد کا شگون نکلتا ہو اور ساتھ ہی اولاد کی حفاظت اور سلامتی کا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہو، جیسے: نائل (حاصل کرنے والا)، واصل (پہنچنے والا، نجات پانے والا)، ناجح (نجات حاصل کرنے والا)، مدرک (حاصل کرنے والا)، دراک (پسندیدہ چیز حاصل کرنے والا)، سالم (محفوظ)، سلیم (محفوظ)، مالک (مالک)، عامر (آباد کرنے والا)، سعد (خوش بخت)، سعید (بختاور)، مسعدة (سراپا سعادت)، اسعد (زیادہ بختاور)

اس جنگجو طبیعت کا حامل عرب کبھی کبھی انتہائی سادگی کا مظاہرہ بھی کرجاتا اور راہ میں نظر آنے والے جانور، حشرات الارض اور پرندوں چرندوں کے نام پر بھی اپنے بچوں کے نام رکھ دیا کرتا۔ ان ناموں سے جہاں ایک طرف دیہاتی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے وہاں دوسری طرف ان کی سادگی اور بھولپن کا پتہ بھی چلتا ہے، جیسے: ثعلب (لومڑی)، ثعلبہ (لومڑی)، ضب (گوہ)، ضبہ (گوہ)، ضبیع (بجو)، کلب (کتا)، حمار (گدھا)، قرد (بندر)، خنزیر (سور)، جحش (گدھے اور گھوڑے کا بچہ)، غراب (کوا)، صرد (لٹورا، ایک پرندہ)، بکر (جوان اونٹ)، عنز (بکری)۔

اپنی اولاد کے بارے میں اس قدر حساس طبیعت رکھنے والے عرب لوگ غلاموں کے بارے میں یکسر مختلف ذوق کے حامل تھے۔ غلاموں کے بارے میں ان کا ذوق نزاکت، شیرینی اور لفظی و معنوی حسن و جمال کا خواہش مند رہتا تھا۔

مذہبی تصورات، اوہام، کہانت اور شگون کو ان کی زندگی میں بڑا دخل تھا۔ عربوں کے یہاں ایسے نام بکثرت ملتے ہیں جن میں عبد کی اضافت کسی مشہور بت، سورج یا ستاروں کی طرف سے کی گئی ہے۔ مثلاً عبدالعزیٰ، عبداللات، عبدمناة، عبدالمدان، عبدشمس، عبدالظہر یا عبدمناف۔

اسی طرح بہت سے نام کاہنوں اور نجومیوں سے پوچھ کر بھی رکھے جاتے تھے۔

قریش اور قحطانی چونکہ متمدن زندگی بسر کرتے تھے اس لیے ان کے ناموں میں ہمیں شہری زندگی کی جھلک ملتی ہے۔ مثلاً حبیب (پسندیدہ)، ربیعہ (عطردان)، حکم (حاکم)، بشر (کشادہ رو)، مروان (چقماق)، مالک (مالک)، خیار (پسندیدہ)۔

عورتوں کے ناموں میں ان کا ذوق نزاکت اور لفظی و معنوی حسن و جمال کی طرف مائل تھا، جیسے: آمنہ (امن والی)، زہرہ (گوری چٹی، سرسبز و شاداب)، عاتکہ (شریف، خوب خوشبو لگانے والی)، خولہ (ہرنی)، ماویہ (آئینہ، محبت کرنے والی)، لیلیٰ (شراب)، ہند (محبت کرنے والی)، برة (نیک)، خنساء (نازک اندام)۔